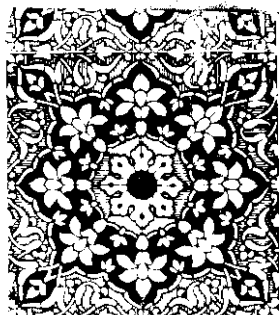


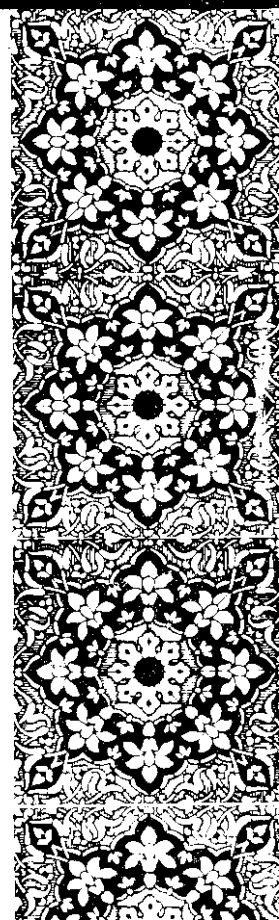
اشاعتِ خصوصی

# اسلام کا معاشی نظام

(ستمبر ۱۹۸۵ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ)



ماہنامہ  
حکمت و فکر  
لاہور

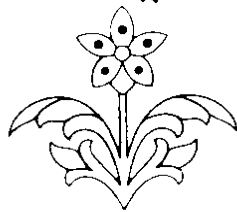


وَأَنْزَلْنَا الْحَائِدَ  
فِي بَرٍّ شَدِيدٍ  
وَمَنْفَعٍ لِلنَّبِيلِ

(الحج: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے  
اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔



اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲ - ایمپرس روڈ - لاہور

قرآن اکیڈمی لاہور

# اسلام کا معاشی نظام

اؤٹ  
اسلامی ریاست کا نظام محاصل



ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-۷۰ ماڈل ٹاؤن ۰ لاہور

# تقدیم

یہ کتابچہ راقم الحروف کی آج سے تین چار سال قبل کی دو تقریروں پر مشتمل ہے: پہلی زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کی گئی تھی اور دوسری محکمہ محنت پنجاب کے زیر اہتمام مل مالکان اور مزدور لیڈروں کے ایک مشترک اجتماع میں کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی تقریریں میں نے حسب عادت روروی میں کہیں تھی اور میرا ہرگز خیال نہیں تھا کہ ان میں ایسی کوئی خاص یا اہم یا نئی بات ہے۔ لیکن ان دونوں کی پذیرائی میرے اندازے سے بہت بڑھ کر ہوئی۔ خصوصاً فیصل آباد کی تقریر کے صدر تھے ڈاکٹر غلام رسول چودھری جو خود معاشیات میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کا تاثر تو ان کے رقم کردہ پیش لفظ میں قارئین کے سامنے آ ہی جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس اجتماع میں چودھری صاحب کے علاوہ مزید نصف درجن سے زائد معاشیات کے پی ایچ ڈی موجود تھے۔ بعد میں چچا کے اجتماع پر ان سب حضرات نے متفقہ طور پر فرمایا کہ آج پہلی بار اسلام کا معاشی نظام کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے اسے کچھ تو ان حضرات کے حسن ظن پر محمول کیا اور کچھ اس پر کہ میری ہمت افزائی مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ان تقریروں کو ہرگز قابل اشاعت نہیں سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضرور خیال تھا کہ کبھی فرصت ملی تو نظر ثانی کے بعد اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن محترم چوہدری غلام رسول صاحب نے ان کی اس درجہ قدر افزائی فرمائی کہ دونوں تقریروں کو خود ڈیپ سے منتقل کر کے، اپنے ذاتی خرچ پر ایک کتابچے کی صورت میں غالباً دس ہزار کی تعداد میں طبع کرایا، اور مفت تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے! آمین۔

ادھر کچھ عرصہ سے بعض احباب کا شدید تقاضا تھا کہ ہم اسے خود اپنے اہتمام میں بھی شائع کریں۔ اس ضمن میں بھی چوہدری صاحب نے مزید کرم یہ فرمایا کہ کتابت شدہ کاپیاں عنایت فرمادیں۔ چنانچہ یہ کتابچہ بالکل من عن اسی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں چوہدری صاحب نے طبع کرایا تھا۔ اس ضمن قارئین سے یہ معذرت کہنے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دونوں تقریروں میں بعض مضامین مکرر آئے ہیں۔ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے، چاہیں تو اسے 'قتد مکرر' سے تعبیر فرمائیں، اور چاہیں تو بد مذاقی پر محمول کر لیں۔

میں چونکہ نہ معاشیات کا باضابطہ طالب علم ہوں نہ فقہ اسلامی کا ماہر — لہذا اس میں غلطیاں لازماً ہوں گی۔ جو حضرات اس ضمن میں مجھے متنبہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ان کا پیشگی شکر یہ!

ان دو تقاریر کے علاوہ اس کتابچے میں مومنوے کی مناسبت سے دو مختصر چیزیں مزید شامل کی جا رہی ہیں: ایک راقم کا ایک مختصر مقالہ جو اس نئے "اسلام کا نظام محاصل" کے عنوان سے لائسنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں بعض اصولی باتیں تو پھر مکرر آگئی ہیں تاہم اہل فکر کے لئے چند نئے نکات قابل غور موجود ہیں۔ اور دوسرے پاکستان کے نظام محاصل کے اس اہم ترین مسئلے پر کہ آیا یہاں کی اراضی عثمانی ہیں یا تاجری، پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مختصر مراسلہ جو "میشاق" جنوری فروری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس مومنوے پر نہایت اہم حوالے موجود ہیں۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور ۲۲ اگست ۱۹۸۰ء

# پیش لفظ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دینی حلقوں میں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ کی بنیادی تعلیم سائنس اور طب کی ہے مگر آپ کی نمایاں خدمات دین اسلام کی تعلیم تبلیغ میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے وقت میں طب کے پیشہ کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اوقات کو دین کے اجراء کے لیے وقف کیا جب امت فحط الرجال کا شکار تھی۔۔۔۔ لہذا ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے شعر سے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق امت کی پاسبانی فرمائی۔

راقم الحروف جب ایچی سن کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھا اس وقت ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا مگر ہر دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری دعوت کو شرف قبولیت بخشا اور نہ صرف کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ایمان افروز خطابات سے نوازا بلکہ کالج کی جڑ وقتی لیکچرر شپ بھی قبول فرمائی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دو اہم خطابات "نجات کی راہ" اور "علامہ اقبال اور ہم" راقم نے بڑے شوق سے طبع کروائے اور بہت پسند کیے گئے۔

بعد ازاں جب مجھے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب تکلیف فرما کر وقتاً فوقتاً یونیورسٹی تشریف لے جاتے رہے اور خطابات جمعہ کے علاوہ "سیرۃ النبی" اور "امت مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" جیسے اہم موضوعات پر یادگار خطاب فرمائے اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کی رکنیت بھی قبول فرمائی۔

راقم کا گہرا احساس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے جو قوت اشتدال، انداز بیان اور قوت افہام عطا فرمائی ہے وہ اس نے آج تک کسی پروفیسر میں نہیں

پائی۔ راقم کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کو زرعی یونیورسٹی کے تاحیات اعزازی پروفیسر بنانے کی تجویز تیار کی برٹینیٹ کوٹنوری کے لیے پیش ہونی تھی۔ معاشیات کے میدان میں اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر کوئی واضح بات "سال سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری کوشش زیادہ تر یہی رہی کہ (Western Economics) میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے، جو مناسب نہیں۔۔۔ چونکہ راقم بھی اسی شعبہ علم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو اس مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ لہذا ہم نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے کلیہ معاشیات و دیہی عمرانیات کے تحت طلبہ و ماہرین معاشیات سے "اسلام کا معاشی نظام" کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لیے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرت باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطاب میں اسلام کی اصلی تعلیمات کو قرآن حکیم کی محکم آیات کے حوالے سے پیش کیا اور عام معمول کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے موجودہ نظاموں میں سے کسی پر اسلام کی ٹر تصدیق ثابت کرنے کی بجائے اسلام کی اپنی تعلیمات کو پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اشتراکی نظام کا آئیڈیل "مساوات" اور سرمایہ دارانہ نظام کا آئیڈیل "آزادی" ہے جبکہ اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب کہ اس کا اصل نعرہ "عدل" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے "روحانی" اور "قانونی" نظام کا جو فرق بیان فرمایا اس نے تو گویا اس موضوع پر جملہ بیچیدگیوں کو حل کر دیا۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھولے گا اور ملکی معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مدد و معاون

غلام رسول چودھری

ثابت ہو گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
تَحَدُّثُهُ وَتَصَلَّى عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

## اسلام کا معاشی نظام

الْحَمْدُ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ  
وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّهِ وَأَنْفُسَنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ  
فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضِلَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ - وَنَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
وَنَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ فَصَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا  
كَثِيرًا كَثِيرًا أَمَا بَعْدُ :

حضرات! اس دور کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے  
جو کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے کہ یہ معاشیات کا دور ہے واقعہ یہ ہے کہ آج کا  
انسان بنیادی طور پر معاشی انسان بن کر رہ گیا ہے۔

اجتماعیات انسانی میں بھی یقیناً معاشیات اور اقتصادیات کو بنیادی  
اہمیت حاصل ہے۔ اور ہمارے ملک میں اسلام کی جانب جو قدم اٹھانے کی  
کوشش کی جا رہی ہے اس کے ضمن میں فطری طور پر یہ سوال ذہنوں کو پریشان  
کر رہا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے؟ بعض لوگوں نے اسلامی اقتصادیات  
کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ایک تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود  
ہے کہ شاید اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے موجودہ نظام میں زکوٰۃ اور عشر کے  
اضافے اور ذرا مزید ہمت کر کے سود کی لعنت کو ختم کر دینے کا نام ہے۔ گویا  
معیشت کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بس اتنا سا تغیر و تبدل ہی مطلوب  
ہے اور اسی بنیاد پر کچھ لوگ بدینتی کے تحت اور کچھ مغالطے سے لوگوں  
کو بظن کر رہے ہیں کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا کوئی حقیقی، واقعی اور



موثر حل موجود نہیں ہے۔ میں اسی لیے آج یہ مجرات کر رہا ہوں کہ اسلام کے معاشی نظام یا قرآن مجید کی اقتصادی ہدایات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔  
حضرات! میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل دو معذرتیں پیش کروں گا اور دو مقدمات۔

## معذرتیں

**الف :** پہلی معذرت تو یہ کہ اصولاً اسلامی معاشیات پر گفتگو کرنے والے شخص کو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا علم بھی براہ راست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن و حدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر بہت گہری ہو۔ ورنہ کم از کم کسی ایک میدان کے اعتبار سے تو وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے علم کی تحصیل کسی درجے میں اس نے مکمل کر لی ہے۔ جبکہ مجھے ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں... میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں۔ البتہ قرآن چونکہ ہُدًی لِلنَّاسِ (تمام انسانوں کے لیے راہنمائی) ہے اور اس کا اصل موضوع ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دینا ہے۔ لہذا اصولاً بھی یہ ممکن نہیں تھا اور فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے کہ معاشیات جیسے اہم موضوع پر کوئی ہدایات اس میں نہ دی گئی ہوں۔ چنانچہ اس میں جہاں عبادات کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کی حکمتیں بھی زیر بحث آئی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے تمام گوشے اس میں موضوع بحث بنے ہیں اور اس ضمن میں احکامات بھی وارد ہوئے ہیں اور ان کی حکمتوں کا بیان بھی ہوا ہے چنانچہ معاشیات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایک طرف تو کھلے کھلے احکام بیان کیے گئے ہیں دوسری طرف کچھ ایسے مقاصد اور بنیادی حکمتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا لحاظ ان احکام میں رکھا گیا ہے لہذا میں ان دونوں پہلوؤں سے کوشش کروں گا کہ اپنے مطالعے کا حاصل آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔

**ب :** دوسری معذرت یہ ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنی بات نہ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں اور نہ میں اس کی کوشش ہی

کروں گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ جن اصطلاحات کے لوگ عادی ہو چکے ہیں انہی کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آجائے۔ مثلاً Capitalism (سرمایہ داری نظام) اور Socialism (اشتراکی نظام معیشت) کی اصطلاحات ہمارے ہاں معروف ہیں۔ لوگ اکثر و بیشتر ان اصطلاحات اور ان کے مفہوم سے بنیادی طور پر واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ ہی یہ نظام ہمارے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں۔ مجھے خوب اندیشہ ہے کہ اس طرح عین ممکن ہے کہ مجھ پر Over simplification کا الزام عاید کیا جائے یا کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں جدید اصطلاحات سے مرعوب ہوں لیکن اس کے باوجود میں بات پہنچانے کے لیے اس طریق کو اختیار کر رہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک بات ذہنوں تک پہنچانے کے لیے یہی طریقہ سب سے موثر ہے۔

## دو مقدمات

اب میں چاہتا ہوں کہ دو مقدمات آپ کے سامنے رکھوں کیونکہ میری گفتگو انہی پر مبنی Based ہوگی۔

**پہلا مقدمہ:** اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کے ہر نظام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک فکری اساس اور دوسرا علمی ڈھانچہ۔ یہ دونوں پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں اور کسی بھی نظام کو اس کی فکری اساس سے ہٹا کر موضوع گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں نظریاتی اساس اور بنیاد کا معاملہ انتہائی اہم ہے جس کو ہم اصطلاحاً ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ . . . اسلام درحقیقت ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر یقین کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے اس کائنات کو اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمَّی (ایک متعین وقت تک) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور ہماری زندگی یہ دُنویٰ زندگی

لے ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظام معیشت ہے۔ جو ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے لیکن یہ چیز اس وقت تک صرف ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کسی معاشرے یا کسی ملک میں یہ نظام قائم کر کے نہ دکھایا جائے

ہی نہیں بلکہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اُس زندگی سے متعلق ہے اس زندگی سے نہیں۔ گویا ہماری اعتقادی اساس اور نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے نسبت و تناسب (Ratio and proportion) میں اس دنیوی زندگی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، یہ تو گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عارضی اور فانی ہے جب کہ وہ ابدی ہے اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی دو بنیادیں ہیں جو قرآن حکیم کی ایک ہی آیت میں ان مختصر الفاظ میں سموی ہوئی ہیں: "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" کہ اللہ ہی ہمارا ابدی ہے اور معاد بھی۔ یعنی ہم اللہ کے پاس سے آتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایمان اگر واقفانہ دل میں موجود ہو تو اس کا حاصل تو یہی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی جائے جیسے کوئی اجنبی ہو یا راہ چلنے والا مسافر ہے۔ ایک راہ گزر کو اپنے راستے سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے اس دنیا اور اس کے تعلقات کے ساتھ اس سے زائد دلچسپی از روئے ایمان درست نہیں ہے۔ اسلام کی اس بنیاد سے دو نتیجے اخذ کیجیے۔

① پہلا یہ کہ اگرچہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام بظاہر تو ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں کیونکہ نظام کے اعتبار سے ایک مشرق کی بات ہے تو دوسری مغرب کی۔ لیکن فکری بنیاد ان دونوں کی ایک ہی ہے یعنی مادہ پرستی۔ یہ مادیت (Materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مادیت ہی بنیاد ہے مغربی جمہوریت (Western democracy) کی کہ جس کے ساتھ کیپیٹلزم کا ضمیمہ لگا ہوا ہے اور اس مادیت ہی کی ایک زیادہ ترقی یافتہ شکل جدلی مادیت ہے جس سے وہ دوسرا نظام پھوٹا ہے جسے ہم سوشلزم اور کمیونزم یا اس کے مختلف شیڈز (Shades) سے پہچانتے ہیں۔ ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے شانے کپڑا کر ازارہ شفقت فرمایا "کن فی الدنيا کانتک غریب او عابر سبیل" دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی اجنبی یا راہ چلنا مسافر۔

دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔

② اور دوسری بات ذہن میں یہ رکھنا ہوگی کہ چونکہ اسلام کا نظام اپنے تفصیلی ڈھانچے سمیت صرف اپنی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ کسی دوسرے نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا لہذا پہلے اس نظر باقی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام کھڑا ہوگا تو ایمان کی بنیاد پر۔

### دُوسرا مُقَدِّمہ

گو ایمان کی رُو سے اصل اہمیت معاد (آخرت) کی ہے، معاش کی نہیں۔ یہ دُنیا اور اس کا ساز و سامان یہیں رہ جانے والا ہے اور انسانوں کے لیے ثانوی اہمیت کا حامل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پورے نظام فکر و عمل میں عدل و قسط اور انصاف کے قیام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قَائِمًا بِالْقِسْطِ (اللہ قسط اور عدل و انصاف کو قائم کرنے والا) ہے۔

پھر اسی کا حکم سورۃ نسا میں ان الفاظ مبارکہ میں وارد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (النساء ۱۳۵)

اے ایمان والو۔ عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔

اور سورہ مائدہ میں یہی حکم عکسی ترتیب سے وارد ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ ۸)

اے ایمان والو۔ اللہ کے لیے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونے والے

اور عدل و انصاف کے گواہ بن جاؤ۔

ان سے اہم تر ہے یہ حقیقت کہ قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں بالکل معین طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کتابوں کے نازل کرنے اور رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد اور اسلام کے پورے نظام کا مرکزی خیال ہی عدل و قسط کا نظام قائم کرنا ہے

اے الکفر ملّۃ واحده۔ کفر کے کتنے بھی رنگ (Shades) ہوں کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ

درحقیقت ایک ہی شے ہے ایک ہی ملت ہے۔

سورۃ آل عمران آیت ۸ -

گویا اسلام کے نزدیک یہ ایک اہم قدر ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ  
النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحديد۔ آیت ۲۵) انبیاء و رسل کے بارے میں اس عام  
قاعدہ کلیہ پر مستزاد ہے وہ ہدایت جو معین طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔  
”تم (اے محمد) اسی دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہنا اور جیسا تمہیں حکم ہوا  
ہے اسی پر قائم رہنا اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا اور کہہ دو کہ جو  
کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے  
حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں“ (سورہ شوریٰ آیت ۱۷)  
جب مسلمان ایران پر حملہ آور ہوئے تو ایرانیوں نے حملے کی وجہ دریافت  
کی تو فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا :  
”ہم تو بھیجے گئے ہیں (خود نہیں آئے) کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے  
نکال کر ایمان کے نور میں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے  
نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں“

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ جو آپ نے بیعتِ  
خلافت کے بعد ارشاد فرمایا تھا اور جو واقعاً ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کو  
متین کرتا ہے اس میں وہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے :

”تم میں سے ہر قوی میرے لیے ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول  
نہ کر لوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے لیے قوی رہے گا جب تک  
اس کو اس کا حق نہ دلوں“۔ تو گویا قیامِ عدل و قسطِ اسلام کا مرکزی

خیال ہے۔

حال ہی میں جو سالانہ قرآن کانفرنس کراچی میں ہوئی اس میں ایک صاحب  
نے بڑی عمدہ بات کی طرف توجہ دلائی کہ اس وقت جو دو نظام دنیا میں قائم ہیں ان  
میں ایک ایک لفظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ کیپیٹلزم کا مرکزی خیال آزادی  
(Freedom) ہے جبکہ کمیونزم کا مساوات (Equality) ہے یہ ان لوگوں کے سلوگن  
ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہ دونوں بڑی اہم انسانی قدیں ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی

خیال (Basic theme) ”عدل“ ہے۔ وہ آزادی اور مساوات دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے۔ گویا وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہٹپ کر جائے یعنی (Freedom at the cost of equality) نہ ہواور نہ ہی مساوات کا ہوا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نکل جائے یعنی (Equality at the cost of Freedom) بھی نہ ہو۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو ہر گوشہ زندگی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

## قیام عدل و قسط کی اہمیت

انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم اور جدید معاشرتی اور سماجی مسائل کی طرف دو صدی قبل توجہ دلانے والے، اور ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کرنے والے عظیم مجدد دین امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام میں عدل و قسط کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس پر انھوں نے بہت عمدہ دلیل قائم کی ہے کہ اسلام یہ عدل اس لیے قائم کرنا چاہتا ہے کہ اگر کوئی جابرانہ اور ظالمانہ (یا جدید اصطلاح میں استحصالی) نظام رائج ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آبادی کی ایک عظیم اکثریت بالکل حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے لیے کسی اعلیٰ سوچ، فکر یا خیال کا امکان ہی باقی نہیں رہتا اور اکثریت کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کولہو کے بیل اور باربرداری کے اونٹ کی مانند اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے جان گسل محنت میں صبح سے شام تک مصروف رہے تو کہاں اللہ سے محبت کرنا اس کو چاہنا، اس سے لو لگا کر بیٹھنا یا کسی اعلیٰ فکر کی طرف متوجہ ہونا۔ گویا اب انسانوں کے لیے اس مقصد کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔

بفحوائے الفاظ قرآنی وَمَا خَلَقْتُ الْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدُنِي کہ میں نے

جنوں اور انسانوں کو صرف بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔

لہذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ نظام عدل و قسط قائم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں

لے ”تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے“

کو موقع حاصل ہو کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں، اس سے محبت کریں اور اس سے لو لگائیں۔

ان دو مقدمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔  
حضرات! اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی دونوں اعلیٰ اقدار کو خوبصورتی سے سمویا ہے وہ نظام کیا ہے؟ میں اس کی طرف آتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے اور یہی میں چاہتا ہوں کہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ وہ یہ کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے دونوں کا ایک نظریہ ملکیت ہے۔ نظریہ حقوق، نظریہ قدر زائد (Surplus Value) ہے یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں اور یہ سب چیزیں ان دونوں میں بالکل جُدا جُدا ہیں۔ کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں لیکن بہر حال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے انٹرکونکٹڈ بھی ہیں۔ بہت حد تک انٹریڈیپنڈنٹ بھی۔ اور اسلام کی برکات اور اس کے ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔

اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو ننگا ہوں سے اوجھل ہو جائے اور توخہ صرف ایک ہی پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہوگی۔ ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی و اخلاقی نظام ہے۔ اور دُوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے

لے ایک اہم بات یہ پیش نظر رہے کہ قرآن و حدیث میں نظام اسلامی یا نظام مصطفیٰ کی اصطلاح نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ نظام کوئی جامد شے نہیں بلکہ ہر دور کی علمی اور معاشرتی سطح کے مطابق نظام وجود میں آتا ہے اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی "ہدایات" اور "حُدود" کی صورت میں ہے۔ اسلام نے حلال اور حرام کی کچھ حدود متعین کی ہیں جن کی جمع و تدوین سے نظام وجود میں آتا ہے۔

امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) اور "جواب دعویٰ" (Anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں۔ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپیٹر مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور ہیں تو اس صورت میں "قہر درویش بر جان درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَاۤ اُولِیۤ الۡاَلْبَابِ (البقرہ-۱۰۹) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے: وَ اَلْكٰذِبِيْنَ الْعٰفِيْنَ عَنِ النَّاسِ (سورہ آل ۱۳۲) یعنی وہ لوگ جو غصہ کو پنی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔ دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک سرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے "سرمایہ دارانہ نظام" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراح صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے



کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی۔ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں "ایسانی تعلیم" کی رو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، ساز و سامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں، اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی گل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدیؒ

ایں امانت چند روزہ نزد ما است      و حقیقت مالک ہر شے خداست

یا بقول علامہ اقبال مرحوم

رزق خود را از زمین برون رواست      این متاع بندہ و ملک خداست

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں بڑی کینفوژن پائی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہل قلم ایسی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی کامل نفی کرتے چلے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی، کہ جب "هَلِ الْعَقْلُ" فرما دیا گیا تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے ہیں جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانون وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے تھے۔ کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حق تصرف (جو بہت قریب ہو جاتا ہے حق ملکیت کے) یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثتاً منتقل بھی کیا جاسکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحاب قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ

لہ بتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔

دوسرا پہلو دب گیا ہے یعنی "قل العفو" کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں نہیں آتی۔ یاد رہے کہ یہ کنفوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دور اول یعنی خلافت راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی مثلاً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلبہ زہد کے باعث یہ رائے قائم کی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپ نے آیۃ کفر کو بالکل اس کے خلاف الفاظ پر معمول کیا۔ خلافت راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام امت جمع تھی اس رائے کو ایک انتہائی موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں انھیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ ایک بیابان میں انھوں نے جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا بلکہ یہ نظام اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے یہی وہ قریبیت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے جاتا رہ سکتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے۔ اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی جائیں گے۔ مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک منالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری کو پورے لیکن رخص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج یہ منالطہ جان بوجھ کر اور بدیتی کے ہوساتھ دیا جا رہا ہے کیونکہ آج تو خلافت راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود ہے اور امت کے اس اجتماعی فیصلہ کو نظر انداز کرنا بغیر بدیتی کے ممکن ہی نہیں۔

۱۷ سُوْرَةُ تَوْبَةِ : ۳۴

حضرت ابوذر غفاریؓ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپ نے زوہر محترم سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں تو انھوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو۔ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے تو، چمچا اور دیچھی کا حوالہ دے کر کہا یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد۔ حضرت ابوذر کے اسی غلبہ زہد کی وجہ سے آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔

۱۸ حدیث جبریل و سُوْرَةُ مَائِدَةِ : ۹۳

## روحانی نظام کے چار اصول

اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں پھر مرتب کر لیجیے۔  
انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

① انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔  
② گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھے۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق ملکیت بتاؤ گے لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں سے اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معین کیا ہے۔

③ انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر، ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔  
الف: اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے۔  
ب: سر چھپانے کے لیے اگر کوئی پھت موجود ہے۔  
ج: پیننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔  
د: اور اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے۔

تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے۔ اس کو پہنچا دو ان تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے بکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی اور یہی ہے درحقیقت وہ مقام جہاں تک "قل العفو" کا سارا فلسفہ پہنچانا چاہتا ہے کہ تمہارے پاس جو بھی 'قدر زائد' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ ضرورت پوری ہو گئی تمہارا حق مکمل ہو گیا اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہے مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔ گویا یہ ایک مکمل نظام ہے اس میں ملکیت اور قدر زائد اور یہاں تک کہ

اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے اس سلسلے میں سورۃ روم کی ایک آیت بارگاہی ملاحظہ ہو جس میں ربو (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے۔ فرمایا :

وَمَا آتَيْتُم مِّن زَبَايِبٍ يُرَبُّوْنَ فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَزْبُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (سورۃ الروم- ۳۹)

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے ربو درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی درحقیقت اس روحانی سطح پر ربو ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمایے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے۔ یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں۔ یا جن کے پاس کاروبار کے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے۔ گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیز ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

## قانونی اور فقہی نظام

حضرت - جیسا کہ عرض کیا ہے اسلام کا قانونی اور فقہی نظام معیشت ایک طرح کے کنٹرولڈ کیپیٹلزم سے مشابہ ہے۔ اس میں تمام فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی رو سے انسان کو اپنے مال پر حق تصرف حاصل ہے۔ عام حالات میں صرف زکوٰۃ کی حد تک اس سے جبراً وصول کیا جائے گا باقی اگر وہ شوق سے چاہے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور خیر کماے۔ لیکن اس کو اس بات کا قانونی حق حاصل رہے گا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کاروبار میں لگائے اور اس کو ورثاً منتقل بھی کرے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں لے اس میں خاص حالات میں استثناء ممکن ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ آزاد سرمایہ کاری، سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلط نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں ان کو ان کے فلسفیانہ پس منظر سمیت دو حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔

**الف :** یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب آزادی (خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو) دی جائے گی تو کچھ اونچ نیچ لازماً پیدا ہوگی۔ دوڑ لگے گی تو یقیناً کچھ لوگ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس فرق و تفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو جب بھی آئے گی اس بات کا امکان بہر حال موجود رہے گا۔ چنانچہ اس کو کھلے دل سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے قانونی نظام معیشت میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کی ہے کہ جو لوگ اس سے اُدھر نکل جائیں دینے والے یا (Donors) ہیں اور اُدھر والے "لینے والے" یا (Recipients) ہیں۔ ان کو Haves شمار کر لیجیے اور اُن کو Have-nots دین کی اصطلاح میں وہ علی الترتیب

"صاحبِ نصاب" اور "میکین" کہلاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم بھی الٹ ٹپ (Arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لائن ہے جو کھینچی جا چکی ہے جس کے پاس اتنے اونٹ ہیں اُدھر اور جس کے پاس نہیں ہیں اُدھر۔ اگر اس قدر سونا ہے تو اُدھر اور نہیں ہے تو اُدھر۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی چاندی ہے اُدھر اور جس کے نہیں ہے اُدھر۔ اس تقسیم کے بعد وہ نظام زکوٰۃ قائم کیا کہ جس کے بارے میں واضح فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "تَوْخَذُ مِنْ اَغْنِيائِهِمْ وَتُرَدُّ اِلَى فُقَرَاءِهِمْ" ان کے اختیار سے مال وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دے دیا جائے گا۔ تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی ناہمواری کا سدباب ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ بھوکے اور ننگے رہ جائیں اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں جبکہ کچھ لوگ اتنا سرمایہ جمع کر لیں کہ کیفیت وہ ہو جائے جس کے بارے میں سورۃ الحشر میں متنبہ فرمایا گیا ہے کہ سرمایہ صرف تم میں سے صاحب ثروت

لوگوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہ جائے جس کی ایک سادہ مثال ایک کروڑ پتی کی بیٹی کا لاکھوں روپے کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کے گھر جانا اور کسی امیر کے بیٹے کی ساگرہ پر امرار کا لاکھوں روپے تحائف کا انبار لگانا ہے۔ اس میں بظاہر سراپا گھومتا ہے مگر صرف اغیار کے دائرے میں۔ یہ معاشی چکّی صرف وہیں گھوم رہی ہے اور اس کا آنا پھلنی سے چھین کر پخلے طبقوں تک نہیں پہنچ رہا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کسی معاشرے میں یا کسی ملک میں جو بھی ذرائع پیداوار اللہ نے تخلیق فرمائے ہیں ان سے جو کچھ بھی حاصل ہو، اس کی ایک منصفانہ تقسیم ہو۔ معاشرے کے تمام افراد پیداوار اور دولت سے متمتع ہوں اور گردش دولت صرف بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ کا مصداق نہ بنے۔

میں جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے "کنٹرولڈ کیپیٹلزم" کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں آجکل اس مفہوم کو Internally managed capitalism کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ سراپہ دار بھی اس بات کو جان چکے ہیں کہ ننگے اور عریاں کیپیٹلزم کا کوئی مستقبل نہیں۔ وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم :-

دیارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکان نہیں ہے  
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا  
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لہذا خود کیپیٹلزم اپنے اندر کچھ نمایاں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال آپ کو برٹش بسٹم میں ملے گی۔ مثلاً جو لوگ کام پر نہیں ہیں ان کو نان ایمپلائمنٹ الاؤنس دیا جائے یا ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے۔ چنانچہ آزاد معیشت بھی ہے کہ جو آگے نکل سکتے ہیں نکلیں۔ لیکن ہر شہری کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ غور کیجیے کہ اسلام کے نظام میں یہ چیزیں چودہ سو سال پہلے آپکی تھیں۔ اس ذمہ داری کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اگر دجلہ اور فرات کے کنارے کوئی گنا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر سے

اس کے بارے میں بھی بازپرس ہوگی۔ انسان تو ہر حال اشرف المخلوقات ہے اس کا حق جانوروں سے مقدم ہے، اسلام آزادی دیتا ہے کہ کماؤ اور کھاؤ، جائز حدود کے اندر اندر خوب محنت کرو۔ کوئی آگے بڑھ جائے اور کوئی پیچھے۔ لیکن یہ معاملہ ایک حد کے اندر اندر رہے اور جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کے لیے زکوٰۃ اور عشر کا نظام قائم کیا گیا۔ کوئی چاہے تو اس کو اجتماعی انشورنس کا نام دے لے۔ اگرچہ اس میں ایک فرق ہے۔ انشورنس کسی بھی نوعیت کی ہو اس کو انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے جو انشورنس اسلام فراہم کرتا ہے اس میں Beneficiary کا کوئی Contribution نہیں ہے اس کے ادا کرنے والے صرف اغنیاء ہیں۔

ب، اسلام نے مساکین اور صاحبِ نصاب لوگوں کے مابین فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے صرف زکوٰۃ کے نظام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس آزاد سرمایہ کاری پر حلال و حرام کی وہ حدود و قیود قائم کی ہیں کہ جن کی موجودگی میں وقتاً سرایہ کاری "سرمایہ داری" نہیں بن سکتی۔ ذرا نگاہ ڈالیے ان اقدامات پر اور قرآن مجید کی حکمت بالغہ پر عرضِ عش کیجیے کہ بنیہ معاشیات کا کوئی عنوان قائم کیسے کیسی بنیادی اور اہم ہدایات دی ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے معاشی نتیجہ نکلتا ہے ایک چھوٹا سا خرابچہ بھی اگر آپ لگائیں تو آپ کو بیس تیس روپے کا مال لگا کر بیٹھنا ہوگا۔ یہی حال بڑی دکان یہاں تک کہ کارخانہ اور مل بھی جو کچھ پیدا کرتے ہیں سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے پیدا کرتے ہیں۔ گو جدید ماہرین اقتصادیات خصوصاً سوشلسٹ مصنفین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ سرمایہ بھی محنت ہی کی پیداوار ہے لیکن یہ بحث درحقیقت مُرعی اور اندھے کی نوعیت کی ہے کہ ان میں سے کون سی شے پہلے ہے۔

ہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں زیادہ زور محنت

پر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دیا گیا ہے جب کہ سرمائے کی حیثیت کم سے کم رکھی گئی ہے اور اس کے صرف اپنی ذاتی حیثیت میں Earning agent ہونے کو کم سے کم تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی بدترین صورت کہ :

۱۔ سرمایہ صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار ہو۔

۲۔ وہ اپنا تحفظ بھی چاہے۔

۳۔ گھائے میں شریک نہ ہو۔

۴۔ اور نفع میں بھی ایک معین شرح لے رہا ہو۔

یہ چار عناصر سود یا ربا کے جزو لاینفک ہیں جسے اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ اس لعنت کو جس طرح اسلام نے اپنے نظام معیشت میں ختم کیا ہے اور جس طرح اس کی جڑ کاٹی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں شراب اور بدکاری کے ارتکاب جیسے جرائم پر بھی وہ انداز اختیار نہیں فرمایا جو سود پر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو اس پر حد تو جاری کی جائے گی لیکن قرآن مجید میں اللہ کا جو غضب اور غصہ سودی کاروبار کرنے والوں پر بھڑکا ہے کسی اور پر نہیں بھڑکا۔ فرمایا کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے تو "فَاذْنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ" (البقرہ) تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور حدیث میں تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سب سے بڑے رمز شاس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

الرَّبْوُ سَبْعُونَ جُزْءًا اَيْسِرُهَا اَنْ يَنْكَحَ الرَّجُلُ امْرَاةً

(رواہ ابن ماجہ و بیہقی)

ربا (سود) کے ستر اجزاء ہیں یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ستر

حصے کیے جا سکتے ہیں اور ان میں ہلکا ترین بھی اس کے مساوی

ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔

یہ انداز بظاہر گھلتا ہے کہ آپ نے یہ انداز تعبیر کیوں اختیار فرمایا، لیکن جب



میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے طبعی نفرت ہے خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ”دیندار“ مگر اصلاً ”کاروباری“ طبقہ ہے۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حج کرنا تو گویا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور دارالعلوم اور مساجد بظاہر قائم ہی انہی کے بل بوتے پر ہیں، شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پرزنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آگئی۔ مگر سود سے ان کو کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میزانِ عدل میں تول کر ایک نسبت و تناسب قائم فرمایا ہے اور واضح فرما دیا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے یعنی معاشرتی بُرائی ہونے کے اعتبار سے یہ زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی سترگنا زیادہ بھیانک ہے۔

بالکل اسی نوعیت کا ہے وہ انداز جو سورۃ الحجرات میں غیبت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے غیبت کرنے کو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح ایک مُردہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا، جیسے چاہو نوح ڈالو، اسی طرح تمہارا جو بھائی موجود نہیں وہ بھی اپنی مدافعت سے قاصر ہے جیسے چاہو اس کی برائی کر لو۔

فی الجملہ ہمارے نظامِ شریعت میں اور احکامِ دین کے اس پورے سلسلے میں جو بدترین بُرائی قرار دی گئی ہے وہ سود ہے۔

اصل میں یہی وہ چیز ہے جس پر سرمایہ داری پروان پڑھتی ہے اور ہمارے

دین میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

**I** اب میں مختصراً بعض دوسری چیزوں کی نشاندہی کرتا ہوں جنہیں اسلام حرام مطلق قرار دیتا ہے :

سرمایہ جب اپنے بل بوتے پر مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور مارکیٹ میں اتنا پڑھاؤ پیدا کرتا ہے، مثلاً ایک شخص سرمایہ کی بنیاد پر کبھی ایک دم بہت سا مال خرید کر قیمتیں بڑھا دیتا ہے اور مارکیٹ کو اونچا لے جاتا ہے اور کبھی ایک دم بہت سا مال (Release) ریلیز کر کے مارکیٹ کے بھاؤ گرا دیتا ہے تو یہ سرمائے کا کھیل بلکہ

ننگا ناچ ہے۔ مارکیٹ میں اس کے بیٹنے بھی ذرائع ہیں ان کو دین اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ مثلاً:

### ① ذخیرہ اندوزی (HOARDING)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور اشیاء خورد و نیاز پر دیا گیا ہے کیونکہ یہ انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہیں۔ اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے باقی اشیائے ضرورت کو بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

”جس نے کھانے پینے کی چیز چالیس دن تک روکے رکھی (بازار میں مانگ ہے مگر وہ اس کو فراہم نہیں کر رہا، چاہتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جائیں) تو وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اس سے بری ہو گیا اللہ کا کوئی تعلق اس سے نہیں اور اس کا کوئی تعلق اللہ سے نہیں!“

### ② سٹہ (SPECULATION)

کچھ لوگوں کی ایک معاشی حیثیت متعین ہے اور وہ سٹہ کھیلتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے مال کے خرید و فروخت کا چکر چلاتے رہتے ہیں مالوں کو وہ نہ بالفعل مال خریدتے ہیں اور نہ بیچتے ہیں اور نتیجتاً مارکیٹ میں آنے سے قبل ہی مال ہر منافع کی تہیں پڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام پیشگی فرضی سودے سرمایہ داروں کا ایک کھیل ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے دین میں جو مال موجود نہ ہو اس کا سودا نہیں ہو سکتا سوائے ایک استثنائی صورت کے جسے بیع سلم کہا جاتا ہے۔

### ③ انشورنس (INSURANCE)

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مختلف چیزوں کی حقیقت کو سمجھیں۔ بغزل علامہ اقبال اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوشنما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں کہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انہی میں ایک انشورنس ہے۔ ہم کسی درجے میں یہ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ شے حرام ہے۔ اس کی حرمت کی

حکمت سمجھیے کہ اس حرمت سے کس طرح سرمایہ کاری (جس کی اسلام میں اجازت ہے) کو سرمایہ داری بننے سے روکا گیا ہے۔

انشورنس کیا ہے؟

اول تو اس میں چانس والا جوئے کا پہلو ہے لیکن اس سے پہلے اس کی اصلیت ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اصل انشورنس تو وہ ہے جو بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار نے دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کارخانہ بنایا فرض کیجیے وہ ایک ماہ جس کی فیکٹری لگاتا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سیلاب آجائے یا کسی اتفاقی حادثہ میں آگ لگ جائے اور سارا کارخانہ جل کر راکھ ہو جائے، لیکن وہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کا تحفظ چاہتا ہے انشورنس کے ذریعے سے۔ لیکن وہ یہ تحفظ بھی اپنی جیب سے نہیں کرتا۔ اس کے لیے وہ جو بہیم (Premium) ادا کرتا ہے اس کو اپنے اخراجات میں داخل کر کے دیا سلائی کی لاگت (Cost) میں شامل کرتا ہے اور دیا سلائی کی ڈبہ کی قیمت اگر ۲۵ پیسے ہے تو

اس میں ایک پیسہ یا کم و بیش وہ سرمایہ دار صارف (Consumer) سے اپنے سرمایہ کے تحفظ کے لیے وصول کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ قومی معیشت کے اعتبار سے تباہی ہوگئی، ملکی سطح پر دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہو گیا لیکن وہ سرمایہ دار اس قومی نقصان سے لاتعلق رہنا چاہتا ہے۔ وہ صارف کی کاسٹ پر اپنے سرمایہ کا تحفظ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کا بھی۔ وہ یہ تحفظ عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈال کر کرتا ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت انشورنس کی۔ گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمائے کا تحفظ ہے۔ اور ”کَيْ لَا يَكُونُ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ“ کی جیتی جاگتی تصویر۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والے شے ہے۔ جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔

**II** معیشت کے ناپسندیدہ طریقے اور وہ طریقے جن کے جائز اور ناجائز ہونے

لے لائف انشورنس کے حق میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اس میں سے مجھے کا پہلو نکال دیجیے تو وہ اتنی سنت چیز نہیں رہتی لیکن حرمت کا پہلو بر حال ہے۔ جس اس کا قائل ہوں۔

کے بارے میں اختلاف ہے۔

اب تک تو میں نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو حرام قطعی ہیں۔ تھوڑا سا نیچے آئیے تو ہمارے دین میں ایک اور دائرہ ہے جس میں اسلام نے کچھ چیزوں کو حلال رکھا ہے یا یہ کہ ان کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے لیکن رُوح دین کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہیں۔ ان سب کو میں ایک ہی گروپ میں لا رہا ہوں۔

### الف: مضاربت :

ایک شخص محنت کر سکتا ہے دکان چلا سکتا ہے مگر اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں ایک کی محنت ہوگی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج وجود میں آئیگا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں جیسے مثلاً طلاق۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اس کی معیشت کا دار و مدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے، محنت کرے اور رزق حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اس کی محنت میں حصے دار بنتا ہے۔ یہ جائز تو ہے کیونکہ اگر کسی بھی درجے میں آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو اس نظام میں یہ گنجائش تو رکھنا پڑے گی۔ لیکن اسلام اس کو بس مجبوراً جائز قرار دیتا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک پسندیدہ چیز وہی ہے جس کا ذکر اخلاقی نظام کے تحت قُلِّ الْعَفْوِ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی دیکھیے کہ اسلام نے کس مضاربت کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں جو

۱۔ امتزاج کی ایک صورت مشارکت بھی ہے کہ دو آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں دونوں سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور دونوں محنت بھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت سرے سے ہے ہی نہیں۔  
۲۔ اَبْفَضِ الْحَلَالِ عِنْدَ اللَّهِ الْمَطْلَاقِ (الحرث) "جائز کاموں میں اللہ کے نزدیک سب سے سحرہ شے طلاق ہے۔"

مضاربتیں ہوتی ہیں ان پر قیاس نہ کیجیے۔ لفظ مضاربت کے اشتراک سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اس نام سے جو کچھ ہے وہ جائز ہے۔ اسلام جس مضاربت کو جائز قرار دیتا ہے اس میں محنت کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے۔ جبکہ سرمائے کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اگر نفع ہوگا تو محنت کرنے والے کو اس میں سے حصہ ملے گا، لیکن اگر گھٹانا ہوگا تو اس کا کوئی بوجھ محنت کش پر نہیں پڑے گا۔ نقصان کا سارا بوجھ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے۔ قرآن مجید میں جہاں تجارت کا ذکر آتا ہے وہاں عَنْ تَرَاضٍ بَيْنَكُمُ (کہ وہ تجارت باہمی رضامندی سے ہو) کی شرط عاید کرتا ہے۔ اگر آپ کوئی شے خریدنے بازار گئے ہیں، آپ کو اس کا بھاد معلوم ہے آپ قیمت دے کر چیز خرید لیں گے اور معاملہ رضا و رغبت کا ہوگا لہذا وہاں یہ شرط پوری ہو جائے گی۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص بالکل مجبور ہو کر قانونی طور پر تو رضامندی ہو گئی آپ کہیں گے کہ میں نے کب اس کو مجبور کیا تھا وہ خود میرے پاس آیا ہے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے تم مجھے سرمایہ دو۔ میں محنت کر لوں گا اور تمہیں اس میں سے حصہ دوں گا۔ کہنے کو تو رضامندی ہو گئی لیکن درحقیقت یہ مجبوری ہے کیونکہ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں۔ اگر ہو تو کوئی کب پسند کرتا ہے کہ کسی اور کو اپنی محنت کے حاصل میں شریک کرے۔ چنانچہ مجبوری کا پہلو اس مضاربت میں موجود ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ حلال تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔

### ب۔ مزارعت :

اسی قبیل کی شے مزارعت ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے اور کوئی دوسرا اس پر محنت کر رہا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہائے اُمت کے درمیان اختلاف ہے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام مطلق ہے

Absentee Landlordism

کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد

اس میں استحان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیتہً بدلنا ممکن نہ تھا۔ لہذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مزارعت پر لفظ ربوہ کا اطلاق کیا ہے، کہ جب آپ نے حضرت رافع ابن خدیج کو دیکھا کہ وہ ایک کھیتی کو سیبج رہے ہیں۔ آپ کے علم میں تھا کہ رافع کی اپنی کوئی زمین نہیں لہذا آپ نے ان سے تفصیل پوچھی۔ حضرت رافع نے بتایا کہ زمین فلاں شخص کی ہے اور محنت میں نے کی ہے اور ہمارے ماہین یہ شرح مفرد ہوتی ہے۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قد آن بیتما" یعنی تم نے ربوہ کا معاملہ کیا، ایک سودی کاروبار کیا۔ اور فرمایا کہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو خرچ تمہارا اس پر آیا ہے اس کی قیمت اس سے وصول کر لو۔ اس لیے کہ اس میں مالک کی محنت شامل نہیں ہو رہی ہے، وہ صرف زمین کی ملکیت کی بنیاد پر اپنے ایک بھائی کی گاڑھے پیسنے کی کمائی میں سے حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں اس میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے، یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لیے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے۔

**III** خرید و فروخت کے عام طریقوں پر قدغنیں خصوصاً جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی ممانعت۔

جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی جو شکل بھی ہو وہ حرام

ہے مثلاً :

۱۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابوحنیفہ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے کے لیے لڑی پڑی کا زور لگایا جاتا ہے۔ "مکو" میٹھا میٹھا ہے اور کڑوا کڑوا مٹھو کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

① ٹھیکے پر زمین دینا۔ مالک نے ایک وقفے کے لیے زمین کی قیمت وصول کر لی ہے۔ اب کاشت کار کو اس سے کوئی بچمت ہوتی ہے یا نہیں، اس کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ گویا یہ تو کھلی ہوئی سود کی صورت ہے اس لیے یہ حرام ہے۔

② باغ میں پھل آنے سے قبل اس کا سودا کرنا بھی ناجائز ہے۔

③ یہ تمام ایڈوانس برنس (Advance Transactions) جو دنیا میں ہوتے ہیں ان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سیدھی سادھی بیع وہ ہے کہ قیمت دو اور مال وصول کرو یا ایک ہاتھ سے چیز لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔ تبادلے کی صورت میں یہاں بھی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی یا کوئی اور مفساد پیش نظر نہ ہو۔ ایڈوانس برنس کے اس طریقے کے باعث Over Trading ہوتی ہے ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں لیکن وہ پچاس ہزار روپیہ بیعاً نہ ادا کر کے پچاس لاکھ کے سودے کر لیتا ہے تو اس سے سرمایہ داری کی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس کو روکا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہے تو پانچ لاکھ ہی کا سودا کرو۔ اسلام میں ادھار کی صورت ایک صورت جائز ہے جس کو بیع سلم کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پوری جنس یا قیمت ادا کر دی جاتے اور دوسری طرف سے مال کی فراہمی یا ڈیلیوری کو موثر (Deter) کیا جاسکتا ہے لیکن آجکل جزوی ادائیگی کے جتنے بھی سودے کیے جا رہے ہیں ان کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

### ④ آڑھت :

اسی کے ضمن میں آڑھت آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”لا یبیع الحاضر للبادی“

کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے۔

یہ آڑھتی جو منڈیوں میں اڑے جا کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مال جو یہ بیچتے ہیں ان کا اپنا نہیں ہوتا اور کئی دفعہ مال موجود بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے اڑے کی وجہ سے فروخت کنندہ اور گاہک دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔ ایک شخص

نے گندم بونی ہے تو وہ خود فروخت کرے اور اگر اس شہر والے کے پاس گندم کی قیمت موجود ہے تو پہلے پوری گندم خرید لے اور پھر اپنے پاس سے اسے فروخت کرے۔

اس اعتبار سے دیکھیے کہ یہ کس قدر دُور رس ہدایت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ورنہ ہمارے ہاں اجناس کی قیمتوں کو بڑھانے والے اور گوشت کی قیمتوں کو چڑھانے والے یہ آڑھتی ہیں۔ لہذا اسلام نے ان کے عمل و عمل کو کم کیا ہے۔

### مڈل مین (MIDDLE-MAN)

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اسلام نے اپنے معاشی ڈھانچے میں مڈل مین کے عمل و دخل کو حق الواسع کم کیا ہے۔

### تقسیم دولت کے لیے اقدامات

- ۱۔ وراثت : اسلام کا قانون وراثت ارتکاز دولت کو ختم کرتا ہے۔ ایک شخص کی جائیداد کا وارث کوئی دوسرا (ایک ہی شخص) نہیں بنتا بلکہ وہ جائیداد اور سرمایہ بٹ کر بہت سے لوگوں کو ملتا ہے۔
- ۲۔ انفاق فی سبیل اللہ اور نفلی صدقات۔

### انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا

جس طرح اسلام دولت کمانے کے لیے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا بالکل اسی طرح انسانی کمزوریوں کو Exploit کر کے دولت کمانے کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً

### ① جنسی جذبہ (SEX)

جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں نے سیکس کو انسان کی کمزوری کہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی انسانی شرمگاہوں کو "فرج" کہا ہے۔ فرج کے لغوی معنی



ہیں اندیشے کی جگہ۔ فیصل میں جہاں دراڑ ہے وہ فرج ہے جہاں سے غنیم کے در آنے کا یعنی حملہ آور کے اندر داخل ہونے کا موقع ہو۔ لہذا انسان کے اس جنسی جذبہ کو مشتعل کر کے کمانے کو حرام مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح آپ کا یہ ساری فلم انڈسٹری اور قحبہ گری کا کاروبار اور نمٹن لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور خرید و فروخت کا دھندا ختم ہو جاتا ہے۔

### ② شراب پر پابندی

اسی طرح شراب بھی حیوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہے چنانچہ اس کے پینے پلانے اور خریدنے اور بیچنے کو حرام مطلق قرار دیا گیا ہے۔

### ③ فضول خرچی

انسان اکثر و بیشتر دولت کمانا ہے تعیش کے لیے، لیکن اسلام میں عیاشی کے تمام دروازے بند ہیں۔ قرآن مجید میں تنذیر (فضول خرچی اور نمود و نہائش) پر حصر کر کے روکا گیا ہے۔ اور گویا اس طریقے سے بھی اسلام نے دولت کے ساتھ انسان کی محبت (Attachment) کو کم کر دیا ہے۔ تو پھر کوئی شخص سرمائے کو کیوں چاہے گا۔

قصہ مختصر سرمایہ داری کی لعنت پر اسلام کا حملہ کسی ایک جانب سے نہیں بلکہ مختلف اطراف سے ہے۔

قویہ ہے وہ نقطہ عدل، کہ آزادی بھی برقرار رہے یعنی اسلام میں جبری مساوات نہیں، لیکن اس بات کا معقول انتظام ہے کہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ رہی وہ جبری اور کلی مساوات جس کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے تو وہ دُنیا میں آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اور فطرتِ انسانی سے بالکل بعید ہے۔

### دو گنجائشیں

① ایک طرف اسلام نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی وقت زکوٰۃ

اور عشر کی حاصل شدہ آمدنی یا خمس اور اس نوعیت کے دوسرے محصولات مثلاً فے وغیرہ کہ جن کے مصارف وہی ہیں لیکن اگر کسی وقت ایرجنسی کے حالات میں ان ذرائع سے حاصل شدہ رقم کفالت عامہ کے لیے کافی نہیں ہوتی تو اسلام غریب اور مساکین کی وکیل عام اسلامی ریاست کو حق دیتا ہے کہ وہ زکوٰۃ وغیرہ سے زائد جبراً بھی وصول کرے۔ یعنی یہ حق ملکیت اس طرح کی (Sanctity) اور اس نوع کا تقدس نہیں رکھتا کہ جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو حاصل ہوتا ہے۔

### ② قومیاں (NATIONALISATION)

دوسری طرف اگر کسی ذریعہ پیداوار کو پبلک سیکٹر میں رکھتے ہوئے عدل کا تقاضا پورا نہ ہونے پاتے تو اسلامی ریاست میں اس ذریعہ پیداوار کو قومیاں (Nationalise) کی گنجائش بھی موجود ہے۔ کیونکہ اصل شے عدل ہے اگر عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو کسی بھی صنعت وغیرہ کو قومیاں میں کوئی قدرغن اسلام کی رو سے نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عرفاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں اور دجلہ اور فرات کی سرزمین اور شام اور فلسطین کے انتہائی زرخیز علاقے اور سبزہ زار مسلمانوں نے فتح کیے تو مطالبہ کیا گیا کہ ان کو مجاہدین کے اندر تقسیم کر دیا جائے حضرت عرفاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر غور کیا اور یہ بڑا نزاعی مسئلہ بنا رہا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی، مجلس شوریٰ کے اہلاس منعقد ہوئے۔ دونوں طرف سے بھرپور دلائل دیے گئے لیکن آخر کار حضرت عمر کے اجتہاد پر اجماع ہوا کہ ایسا کرنے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، سب زمینیں اسلامی ریاست کی ملکیت (سیٹ لیٹڈ) ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے (Tenants) مزارعے کی حیثیت سے برقرار رہیں گے۔ وہیں کے لوگوں کو حقوق دیے گئے اگرچہ وہ ملکیت کے حقوق نہیں تھے لیکن ایک نوع کی موردی مزارعت تھی کہ وہ ان میں زراعت کریں گے اور اسلامی ریاست ان سے لگان یا خراج وصول کریگی ذہن میں رکھیے کہ اگر خدا نخواستہ اس موقع پر حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد سامنے نہ آتا تو دُنیا

لے یہ سب اسلامی ریاست کے حاصل ہیں اور ان سب کا بڑا حصہ وہ ہے کہ جو Have-nots کی کفالت کا ذریعہ بنے لے اسلامی ریاست میں Taxes کی اجازت ہے۔

میں بدترین جاگیرداری نظام اسلام کے ذریعے سے رائج ہو جاتا۔ کیونکہ عراق اور شام کے فاتحین لاکھوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں تھے اور اگر وہ تمام زمینیں ان میں تقسیم کی جاتیں تو وہ سب بڑے بڑے جاگیردار بن جاتے۔

## آخری بات

میں نے یہ دو نظام آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اسلامی ریاست میں یہ نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کی برکات کا ظہور صرف اس قانونی نظام سے نہیں ہوگا۔ میں واضح کر دوں کہ جب تک معاشرے میں بالفعل ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں، یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جس میں اصل قدر دولت کی ہے۔ جس کے پاس دولت و سرمایہ ہے وہ صاحبِ عزت ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا نیک آدمی بھی بھک کر ملے گا۔ ذرا چمٹم تصور میں لائیے، شیخ احمد سرہندی، یا سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کو جو قرآن کی ایمانی تعلیمات کا مظہر تھے ان کو دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے وہ دنیا کی کسی شے کی ملکیت حاصل کر کے بھی خیز کرنے والے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو بھھت اگر ہے تو کافی ہے۔ اس پر مزید حصول کی ان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دولت کے انبار اور شاہی سلطنت کا جاہ و جلال ان کو متاثر نہیں کرتا اور وہ عملی نمونہ ہیں ”قل العفو“ کی قرآنی تعلیم کا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو Inspire کرتے ہیں اور ان سے معاشرے میں اقدار کا تعین ہوتا ہے جن کی موجودگی میں وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے کہ اصل مسئلہ ”معاش“ کا نہیں دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ کا نہیں بلکہ ”معاد“ کا ہے، آخرت کا ہے۔ اصل چیز دولت و ثروت نہیں، نیکی اور عمل صالح ہے۔ اللہ کی محبت، اس کی بندگی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کی سنت کا اتباع ہے۔ اور اگر روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صرف قانونی نظام سے اسلام کی برکات کا ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

اس بات کو ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھیے کہ معاشرے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثال کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہمیں اصحاب صفہ کا فقر سامنے رکھنا چاہیے کہ ان کے پاس لنگڑیاں تھیں تو اتنی کہ سجدے میں جاتے ہوئے ان کو اندیشہ ہوتا کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے، پیچھے والے ان کا تنگ نہ دیکھیں۔ منتظر رہتے کہ جب سب لوگ سجدے میں چلے جائیں تو وہ سجدے میں جائیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے سب کچھ تاج دیا تھا اللہ اور اس کے رسول کے واسطے۔ انہیں میں سے ہیں حضرت ابوالدرداء، حضرت انس بن مالک، حضرت مقداد، حضرت ابوہریرہ اور انہی میں ہیں حضرت ابوذر بھی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اگر معاشرے میں بالفعل وہ لوگ موجود نہ ہوں کہ جن کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ بھی ہیں کہ کہیں رشتہ کرنا چاہیں تو کوئی انہیں رشتہ نہ دے کسی کی سفارش کرنا چاہیں تو کوئی ان کی بات ہی نہ سُنے۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ کسی بات پر اگر وہ اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پیکر محسوس کے خوگر انسان اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھیں اور پھر ان میں جذبہ بیدار ہو قربانی کا خدا پرستی کا سادگی کا۔

آخر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دین کل کی حیثیت سے ایک وحدت (Organic whole) ہے ہم نے اپنی سہولت کے لیے اس کے حصے بخرے کر لیے ہیں جو چیزیں طبیعت پر گراں گزریں ان میں حیلوں کی چابی لگا کر حلت و جواز کے لیے کہیں نہ کہیں سے کوئی راستے نکالے اور اب جو نتیجہ اس سے نکلا ہے آپ اس کے اوپر صرف لیبل بدل کر عوام کو یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلام آگیا ہے تو یہ اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں آج وہ تقاضے یکسر بدل چکے ہیں رکسی دور میں امتحان اور مصالحہ مسلحہ کا کسی ایک طرف رُخ تھا تو آج دوسری طرف رُخ ہے آج ضرورت ہے کہ اجتہاد کر کے اسلام کا پورا نظام جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت (Totality) کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام۔ اگر نافذ کرنا ہے تو اس کو پورا کا پورا نافذ کرنا ہوگا اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس وقت کی ہے۔ ❀❀❀

## سرمایہ اور محنت

محترم صدر مجلس اور معزز خواتین و حضرات! آج میں اس مجلس میں خطاب کرتے ہوئے کچھ وقت سی محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ میں قرآن مجید کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور اس اعتبار سے مجھے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی پیش کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ تاہم یہ ٹیکنیکل مسئلہ سرسرمایہ اور محنت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ واقعتاً دورِ جدید کے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ بلکہ اس کو اگر تقریباً لائینکل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس امر سے کہ مجھے اس میدان میں کبھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک طرف میں معروف معنی میں محنت کش بھی نہیں اور دوسری جانب سرمایہ دار تو کیا سرمایہ کار بھی نہیں ہوں، لہذا اس کوچے میں میری حیثیت عملی اعتبار سے بالکل نووارد کی سی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترم بہن صبیحہ شکیلہ صاحبہ اور محترم سردار صاحب نے میرے لیے مزید وقت پیدا کر دی یہ فرما کر کہ وہ تو اس اجلاس میں اصلاً میری تقریر سننے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوسرے اصحاب نے بھی اصل راہنمائی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال کر میری ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہذا میں پوری کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر ذہن کا جو بھی تھوڑا بہت فہم مجھے حاصل ہے اس کی روشنی میں ان مسائل کا ممکنہ حل آپ کے سامنے رکھوں۔ بیدہ التوفیق وعلیہ التکلان۔

ہمارے ہاں بعض اصطلاحات بہت غلط استعمال ہوتی ہیں۔ آجر

**آجر اور اجیر نہیں آجر اور مستاجر**

اور اجیر میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔

اُجرت پر کام کرانے والے کے لیے اصل اصطلاح ”متاجر“ ہے۔ اسی قبیل کا ایک لفظ ”متوفی“ ہے جس کے اصل معنی ہیں وفات دینے والا۔ یعنی الشہد، نہ کہ جو فوت ہو رہا ہے جس کے لیے اصل لفظ ”متوفی“ ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ ”مغویہ“ ہے جس کے معنی ہیں اغوا کرنے والی۔ جبکہ اغوا کی جانے والی ”مغواۃ“ ہے تو متاجر وہ شخص ہے جو کسی سے اُجرت پر کام لے رہا ہو۔ اور آجر ہے وہ شخص جو اُجرت پر کسی کے ہاں کام کر رہا ہو۔

چونکہ مقالے کا اصل موضوع ہے ”اسلام میں محنت کا تصور۔“

## محنت یا عمل

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ محنت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ لفظ اگرچہ عربی زبان ہی کا ہے مگر نہ قرآن مجید میں اس معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ حدیث نبوی میں، نہ ہی موجودہ فصیح عربی میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح ”عامل“ ہے۔ یعنی عمل کرنے والا یا محنت کرنے والا۔ پھر دوسرا لفظ وہی آجر یا ابیر استعمال ہوتا ہے۔

## قرآن مجید میں کمائی کا اصل تصور

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ اس سلسلے پر ہمارے لیے قرآن مجید حدیث میں بہت کم راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی اصل کمائی نیکی یا بدی کی ہے، چنانچہ اس میں اصل زور ”کسبِ خیر“ کی ترغیب اور ”کسبِ شر“ سے اجتناب پر ہے یعنی قرآن کا اصل Emphasis معاش پر نہیں بلکہ ”معاذ“ پر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ استثنائی مثال کے ”کسب“ کا لفظ قرآن مجید میں رزق کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا۔ الغرض از روئے قرآن انسان کی اصل کمائی وہ خیر و شر یا بھلائی یا بُرائی ہے جو وہ آخرت کے لیے کما رہا ہے، یہ اصل کسب ہے۔ اس کے برعکس رزق کھیلے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ”فضل“ ہے یعنی قرآن جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ نہیں بلکہ فضل خداوندی ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ قارونیت ہے کہ انسان اس مغالطے یا زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو ذیوی سازد سامان یا مال و متاع اسے حاصل ہے وہ اس کا اپنا پیدا کردہ ہے جیسے کہ قارون نے کہا تھا کہ اَوْتَيْنَا عَلَىٰ عِلْمٍ وَعُدَّ عَنِّي يَعْنِي يَهِي سَبَّ كَچھ مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے گویا یہ میرے علم و فہم، میری ذہانت و فطانت، میری پیش بینی و پیش بندی میری بلائنگ

اور فرسائٹ (Foresight) کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے اس کی تعلیمات کی دُور سے محنت انسان ضرور کرتا ہے مگر جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ سراسر اللہ کا فضل ہے نہ کہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کے لیے اصل بنیاد یہی تصور فراہم کرتا ہے جبکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل بنیاد ہے "قانونیت"۔

حدیث شریف میں محنت یعنی مزدوری اور

## محنت کا ذکر حدیث نبوی میں

عمل یہ یعنی انسان کے خود اپنے ہاتھ

سے کام کرنے کی بڑی عظمت و فضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَا بَعَثَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْعَنَمَ فَقَالَ اصْحَابُهُ "وَأَنْتَ؟" قَالَ "نَعَمْ كُنْتُ ارْعَى عَلَى قَرَارِيطٍ لِأَهْلِ مَكَّةَ"

یعنی اللہ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے اُہرت پر بھیڑیں نہ چرائی ہوں صحابہ نے (متحیر ہو کر) سوال کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے بھی یہ کام کیا ہے؟ اس کا جو جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ ہم سب کے لیے بہت اہم ہے، اس لیے کہ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تواضع و انکسار بھی نمایاں طور پر جھلک رہا ہے۔

"میں تو چند قراریط کے عوض (چند ٹکوں کے عوض) مکہ کے لوگوں کے جانور چرایا کرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ اہرت یا مزدوری پر دوسروں کے لیے کام کرنا ہرگز باعثِ ندامت یا موجبِ شرم نہیں ہے۔ اس لیے اگرچہ یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ جو شخص خود اپنے سرمائے سے کام کر رہا ہو خواہ وہ چھا بڑی ہی لگاتا ہو اس کے لیے کسی احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ انسان کسی اور کے لیے اُہرت پر کام کرنے میں یقیناً عار محسوس کرتا ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے فرمایا کہ میں خود اہرت پر دوسروں کیلئے کام کرتا رہا ہوں۔ لہذا یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس پر انسان کسی بھی درجے میں ندامت یا شرم محسوس کرے۔"

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام

## حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیتِ اجیر

کے اُہرت پر کام کرنے کا ثبوت

قرآن مجید سے ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام پورا صحرائے سینا پیدل عبور کر کے "ماریدین"

یعنی مین کی بستی کے باہر کنویں پر پہنچے تو قرآن مجید نے ان کی اس وقت کی بے چارگی اور  
 دنیوی اعتبار سے بے وسیلہ ہونے کی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لیے ان کی دعا کے یہ الفاظ  
 نقل فرمائے ہیں کہ رَبِّ ارزُقْنَا لِمَا أُنزِلَتْ لِي مِنَ خَيْرِ فَحَقِيرٌ (القصص) یہ رور دگار! جو خیر بھی  
 تو میری بھولگی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں یعنی میری حالت اس فقیر و مسکین کی ہے جسے  
 ایک پیسہ بھی دیا جائے تو وہ اسے نہیں ٹھکراتا بلکہ شکر ہے کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ تو یہ ہیں وہ  
 الفاظ جو اللہ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے۔ وہاں  
 جب اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرمادی کہ شیخ مین کی صاحبزادیوں نے ان کی جس جسانی قوت  
 اور اخلاقی عصمت و عفت کا پچھتم سر شاہہ کیا تھا اس کی بنا پر انھوں نے اپنے والد  
 سے سفارش کی کہ يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ زَانًا حَيْرٌ مِّنْ اسْتَأْجِرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص) یعنی  
 آبا جان! بہترین شخص جسے آپ اجرت پر کام کرنے کے لیے رکھیں قوی بھی ہونا چاہیے  
 اور امین بھی، اور دونوں صفات اس شخص میں موجود ہیں۔ اور شیخ مین نے آگے بڑھ کر  
 اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے نکاح کی پیشکش حضرت موسیٰ کو کر دی تو  
 آٹھ یا دس برس کی مزدوری ان کا مہر قرار پایا اور حضور کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام  
 نے اپنی عصمت و عفت کی حفاظت اور اپنا بیٹھ بھرنے کے لیے آٹھ یا دس سال  
 مسلسل مزدوری کی۔

”إِنَّ مَوْلَىٰ أَجْرَ نَفْسِهِ ثَمَانِ سِنِينَ أَوْ عَشْرًا عَلَىٰ عِفَّةٍ فَرِحَهُ وَ  
 طَعَامٍ بَطْنِهِ“ رواہ احمد و ابن ماجہ۔

**حضرت داؤد اور عملِ یوم** | اسی طرح بخاری ہی کی ایک اور حدیث کا

مَعْدَادِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ  
 خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ وَكَانَ نَبِيُّ اللَّهِ دَاوُدَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ“

(ترجمہ) کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جس نے اپنے ہاتھ سے کام  
 کر کے روزی کھائی اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کھاتے تھے۔

اور یہی بات ہمیں اپنے ماضی قریب  
**ناصر الدین محمود اور اورنگزیب عالمگیر**  
 کی روایات میں بھی نظر آجاتی ہے



ناصرالدین محمود اور اورنگ زیب جیسے بادشاہ اسی برصغیر میں گزرے ہیں جنھوں نے شاہی خزانے سے کوئی استفادہ کرنے کی بجائے خود محنت کر کے اپنی گزر اوقات کا سامان مہیا کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ باتیں سطحی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ باتیں ہماری فکر و سوچ میں سرایت کر جائیں تو ایک عظیم انقلاب واقع ہو جائے۔

اب آئیے اس موضوع پر دینی تعلیمات

## اہرت کی ادائیگی میں عجلت

کی جانب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے حقوق کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ابن ماجہ کی وہ مشہور حدیث آتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاص (رضی اللہ عنہما) ہیں۔ یعنی ادتوا الاجیر اجرہ قبل ان یحفت عرقہ ۴

(ترجمہ) مزدور کو اس کی اہرت ادا کر دو اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔

اور دوسری حد درجہ جامع حدیث

## ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک

وہ ہے جو ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت معمر بن سوید سے روایت کی ہے۔ جس میں اصل واقعہ تو حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہوا ہے لیکن ضمناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل اور دائمی ہدایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔

حضرت معمر ابن سوید بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کو ان کے ایک غلام کے ساتھ دیکھا کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طرح کا حلہ پہن رکھا تھا اس پر انھوں نے (حضرت معمر نے) پوچھا: آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس پر حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو گالی دی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت سرزنش فرمائی اور ارشاد فرمایا: ہم اخوانکم جعل اللہ تحت ایدیکم یعنی یہ تمھارے ہی بھائی ہیں، انسان ہیں، آدم اور حق کی نسل سے ہیں۔ اللہ نے انھیں تمھارے ماتحت کر دیا ہے۔

اس کے بعد آپؐ حکم دیتے ہیں: فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ ممثلاً

يَاكُلُ وَيَلْبَسُهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تَكْفُرْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِن كَلَفْتُمْوَهُمْ فَاعِينُوهُمْ" جس شخص کے ماتحت اللہ نے کسی اور شخص کو کر دیا ہو تو اسے چاہیے کہ جو کھانا وہ خود کھاتا ہے اسے بھی کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی پہنائے۔ ان پر اتنا بار نہ ڈالو جس سے وہ دب کر رہ جائیں اور اگر ایسی مشقت ڈالنی لازم ہی ہو جائے تو خود بھی شریک ہو جاؤ اور ان کی مدد کرو۔

یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح

## سوال کی مذمت اور محنت مزدوری کی ترغیب

سوال کرنے کی بجائے محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دلاتی ہے وہ بھی پیش نظر رہے: لَان يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ أَحْبَلَةً ثُمَّ يَأْتِي الْجِبِلَّ فَيَأْتِي بِجَزْئَةٍ مِّنْ حَبِيبٍ عَلَى ظَهْرِهِ فَيُعِيهَا فَيَكْفُفُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ لَّهُ مِّنْ أَنْ يَسْئَلَ أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ (بخاری عن زبیر بن العوام) "تم میں سے کسی شخص کا رسی لے کر پہاڑ پر چلا جانا اور پھر لکڑیوں کا گٹھہ پیٹھ پر لاد کر بیچنا اور اس طرح اپنے چہرے کو (یعنی عزت نفس) بچانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی (انسان) سے سوال کرے اور وہ چاہے تو اس کو کچھ دے دے اور چاہے تو خالی ہاتھ لوٹا دے۔"

تو یہ ہیں وہ اصول جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماتحتوں کے بارے میں وضع فرمائے ہیں اور یہی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات کہ جب تک وہ کسی معاشرے میں بافضل موجود نہ ہوں تو محض کوئی خشک قانونی ڈھانچہ خواہ اس کی کتنی ہی پیروی کیوں نہ کر لی جائے، معاشرے میں وہ برکات پیدا نہیں کر سکتا جو اسلام کی منشا ہیں اور جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے کیونکہ ایک تو اس تعلق نظام اقتصادی کے ساتھ ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی اجتماعیات کے تمام پہلو یعنی سماجی، سیاسی اور معاشی مل کر ایک ناقابل تقسیم وحدت بنتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر کے اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات کی بنیاد پر جو نظام حیات وجود میں آئے گا اس کا اپنا ایک سماجی نظریہ ہوگا اور اسی کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ایک معاشی

نظام وجود میں آئے گا اور اسی نوعیت کا سیاسی ڈھانچہ بھی ترتیب پائے گا اور سب مل کر ایک Organic whole بن جائیں گے لہذا ان میں سے کسی ایک جز کو نکال کر اس کی کسی اور نظام کے ساتھ پیوندکاری ناممکن العمل فعل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اصطلاحات مستعمل ہیں مثلاً اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اسلام کے ایمانیات، عبادات اور اخلاقیات لے کر دوسرے نظام ہائے زندگی کی عملی تشکیل کے مابین پیوندکاری کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصل مغالطہ ہے۔ اسلام کی بنیاد اپنے ایک نظریے پر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اس جڑ پر اگر تنا کھڑا ہوگا تو اس سے نکلنے والی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں گی لیکن اگر وہ جڑ کمزور ہو یا اس جڑ کا بحیثیت جڑ سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کسی بھی مصنوعی طریقے سے پیوندکاری کر کے اسلام کی برکات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

## ایمان کیا ہے

خدا اور اس کے رسول پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی نہیں اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے عمل کا نیکی اور بُرائی کی صورت میں بدلہ ملے گا یہ یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حروفِ آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی، تو یہ فانی ہے عارضی ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں، اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی اس ایک آیت میں سموتی ہوئی ہیں: **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ كَاجِعُونَ** (اللہ ہی ہمارا مبداء و معاد ہے، ہم اس کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) گویا! یہ ایک سفر ہے۔ جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "کن فی الدنیا کانت غریباً او عابرسمیل" الحدیث کے مصداق ایک "اجنبی" یا "راہ چلتے مسافر" کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے راہ چلتے مسافر کو اس راہ گزر سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے مومن کو بھی اس دُنیا سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کا وجود | اس وقت دنیا میں بالفعل تو دو ہی نظام ہائے معیشت موجود ہیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت

رہا اسلام کا نظام معیشت، تو وہ دنیا کی ایک ایچ زمین پر بھی بالفعل قائم نہیں ہے اس کا وجود تو صرف ہمارے ذہنوں میں ہے یا ہماری زبانوں کی نوک پر یا اسی قبیل کی چیز ہے قلم جس تک یہ تصور محدود ہے۔

اسلام بمقابلہ اشتراکیت و سرمایہ داریت | یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اگرچہ اشتراکیت (Communism)

اور سرمایہ داریت (Capitalism) دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب، لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ آپس میں تو متضاد اور مقابل ہیں لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادیت کے مقابلے میں روحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔۔۔ یہ فلسفہ مادیت ہی تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical materialism) کی شکل اختیار کر لی اور Communism وجود میں آیا۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے اور کسی قسم کی پیوندکاری قبول نہیں کرتا۔ لہذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کے ڈھانچے کا خیال گاڑی کے آگے گھوڑا باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے اس لیے کہ اسلام تو "ایمان" ہی کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جڑ یا بنیاد پر اس کے قیام کا تصور ہی بے کار ہے۔

اسلام میں عدل و قسط کی اہمیت | اسلام کی متذکرہ بالا اساس یعنی ایمان کو استوار کرنے کے ساتھ ساتھ

اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اسلام نے عدل و قسط کے قیام کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ شریعت، انزال کتب اور بعثت رسل کا مقصد نیز دین کا پورا ڈھانچہ

ان سب کا مرکزی خیال قیام عدل و قسط ہے یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قائِمًا بِالْقِسْطِ (انصاف کا قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشادِ خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ  
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ (النساء) والے اور اللہ کے گواہ بنو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ  
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ۔ (المائدہ) اے اہل ایمان! اللہ کے گواہ بنو تاکہ عدل و انصاف قائم ہو۔

یہ ایک ہی بات کو دو پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس خوب صورت انداز میں کہ رُوح و جد کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا :

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا  
مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ  
بِالْقِسْطِ۔ (الحمدیہ) ہم نے اپنے رسول بھیجے بیانات نازل فرمائیں اور ہم نے میزان اتاری اس لیے کہ لوگ عدل و انصاف پر کاربند رہیں۔

وَقُلْ أَمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ  
كِتَابٍ وَأُمرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ  
(شوری) اور کہو! میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے مجھ پر اتارا اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں۔

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا :

انا قد اُرسَلنا لنُخرج الناس  
من ظلمة الجهالة الى نور  
الایمان و من جور الملوک  
الى عدل الاسلام۔ ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھروں سے نورِ ایمان کی طرف نکالیں اور دشمنی ہی استبداد سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا : تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے ہر

ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دلوں دوں۔ گویا نظام عدل و قسط کا قیام، اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

## امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن (Slogan) بن جاتے ہیں (Capitalism) میں آزادی (Freedom) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے اس طرح اشتراکیت (Socialism) میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس میں نوع انسانی کے لیے کشش ہے اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی ان کے مقابلے میں اسلام نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے "عدل" کا تصور دیا ہے وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہرپ کو جائے اور نہ مساوات کا ہوا کھڑا ہو کہ آزادی جیسی اعلیٰ اقدار سے انسانی معاشرہ کو محروم کر دے۔ "آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی" اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس کو اسلام کا امتیازی سلوگن قرار دیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں نظام عدل کے قیام کی غرض آخر کیا ہے؟ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہ نے توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں :

قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے، کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبدیر بلکہ راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بے جا اور فضول خرچ کرنا۔

- |   |  |
|---|--|
| اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ | ① وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (الاعراف)           |
| اور بے جا خرچ نہ کرو بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔           | ② وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا. إِنَّ الْمُبْذِرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ (بنی اسرائیل) |
| اور اپنے ہاتھ کو اپنی گزوں کے ساتھ باندھ کر                                   | ③ وَلَا تَحْمِلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ مَحْفِلِكَ  |

نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے ورنہ  
تُو خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جائے گا۔

اور (مومن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ  
کرتے ہیں تو فضول نہیں کرتے اور تنگی کرتے  
ہیں بلکہ ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان  
اعتدال پر ہوتا ہے۔

وَلَا تَبْسُطْهَا كَلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ  
مَلُومًا مَّحْسُورًا - (بنی اسرائیل)

۴) وَالذِّينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا  
وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ  
قَوَامًا - (سُورَةُ الْفِرْقَانِ)

معاشرے کے تین معروف معیارات  
عموماً معاشرے میں تین قسم کے  
معیار زندگی پائے جاتے ہیں:

- ا : رفاہیت بالغہ یعنی عیاشانہ معیار زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی  
جاتی ہے اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔
- ب : رفاہیت ناقصہ یعنی پست معیار زندگی۔ جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح  
حاصل نہیں ہوتیں اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔
- ج : رفاہیت متوسطہ یعنی درمیانہ معیار زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے  
میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی  
بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ عیاشی کو ناپسند فرمایا ہے۔ اور ایسی معاشرت اختیار  
کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور  
معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعین اور غلو کرنے لگے۔  
پچانچہ رشیم اور سونے چاندی کے بزن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن، گلوبند، ہار، طوق  
پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین  
میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی  
اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعز  
کیا جائے۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیزیں سے سب سے اعلیٰ  
کا انتخاب کیا جائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۱۰۷)

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیار زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی

علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے۔ شہروں کے وہ لوگ بھی اس ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انھیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں جس سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی ہو جاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادتِ اخرویہ کی طرف متوجہ ہو پاتے ہیں بلکہ ان میں سعادتِ اخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کر سکے بلکہ۔

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیلیوں کو فرعونوں نے جکڑا ہوا تھا کہ صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جا رہی ہے۔ کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انھیں فرصت ہی نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے، کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس لیے اسلام نظامِ عدل و قسط قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف قانونی نظام بلکہ سماجی عدل بھی۔ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں اس سے لو لگائیں اس سے محبت کریں اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کریں اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انھیں اس کے لیے فرصت ہو، وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں۔

ع۔ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اسلام کے معاشی نظام کے دورِ رخ | اسلام کس قسم کا معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا

ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی



نظام کے دو رخ یا پہلو ہیں یا یوں سمجھیے کہ دو حصے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے، اپنا نظریہ ملکیت اور نظریہ حقوق ہے اور اسی طرح دونوں کا اپنا نظریہ قدر زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں جدا جدا ہیں اور اپنا جدا گانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورہ رحمن کی آیت مبارکہ

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا  
بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ

وہ دو تھیں جو برابر چل رہی ہیں مگر ان کے  
درمیان ایک غیر مٹی پرودہ حاصل ہے جو انہیں  
باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔

کے مصداق اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے  
وہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں غلط سمجھت ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے نقطہ نظر  
کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔

**غلط سمجھت**

جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کائل نفعی کرتے ہیں۔  
ضرورت سے زائد ہر چیز چھین لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں  
مثلاً قانون وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے اس کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم  
کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفعی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز  
ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف بلکہ ورثاً جائیداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم  
کیا گیا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں تو اسلام کے قانونی نظام کا  
دم بھرتے ہیں جبکہ اس کے روحانی نظام کو نظر انداز کرتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو  
اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے  
سامنے گھوم جاتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر  
کسی غلط فہمی کی بنیاد پر بھی پیدا ہو  
سکتے ہیں اور خلوص نیت کے ساتھ بھی اسلام کے قرآن اول میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی

**حضرت ابوذر غفاریؓ کا طرز عمل**

چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا "آیہ کمنز" کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انھیں مدینہ بدر کیا گیا اور مدینہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہو رہا تھا تو صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں مگر ان کے احساسات یہ تھے کہ ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے اور بار بار کہتے تھے: "حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے اور یہ مجھے نظر آرہے ہیں" اہلیہ محترمہ نے کہا: "کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو جو ہم نے جمع کر لیے ہیں" تو فرمانے لگے: "وہ دیکھو تو ہے، استعمال کے کپڑے ہیں اور یہ سب بچھو ہی ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے روحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے اور اسی بات سے مخالفت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کامل خلوص کے ساتھ لاحق ہوا، لیکن بنی تہی کے ساتھ بھی یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اخلاقی و روحانی نظام کے اصول

اسلام کے اخلاقی یا روحانی نظام کے چار اصول ہیں۔

- ① ملکیت کی نگلی نفی۔
- ② انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اس کی عطا ہے۔
- ③ انسان کا حق اس کی جائز ضروریات ہیں۔ بعض احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں متعین فرما دیا ہے یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے سامان، سر چھپانے کے پھت، دو جوڑے کپڑے اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے بیوی۔
- ④ اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لیے وقف کر دے گو کہ قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔

تو یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے اس میں نظریہ ملکیت بھی ہے اور اپنے حق کا تصرف بھی۔ نیز اگر قدر زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

قرآن مجید میں ربو کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے۔

۱۔ ربو بمقابلہ بیع وَ اَحَلَ اللهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ)

۲۔ ربو بمقابلہ صدقات اور تزکیہ نفس کے واسطے خرچ کرنے کے جیسے "وَمَا اُذُنُكُمْ مِنْ سُرْمَاوَةٍ قُرَيْدٍ وَجْهَ اللهِ فَاولئك هم المضعفون" (الروم)

اسلام کی روحانی تعلیمات میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۃ البقرہ کی اس آیت میں کہ يَمَعَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتِ اللہ ربو کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ ان آیات میں صدقات کے مقابلے میں ربو کا لفظ آیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک انسان یا مثلاً ملازم پیشہ آدمی کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس صورت میں اس کی محنت اس میں شامل نہیں ہوگی۔ اب اس اخلاقی نظام میں فاضل سرمائے سے جو بڑھوتری ہوگی وہ بھی ربو قرار پائے گی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لیے سرمایہ موجود نہیں انھیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزق حلال باعزت طریقے سے حاصل کرے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گویا قانونی طور پر جائز بھی ہو، اخلاقی اور روحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہوگا۔ اس لیے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر زیادہ نہیں تو انھیں یہ سرمایہ بطور قرض حسنہ ہی دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحبِ عزت اور صاحبِ حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کا فرق و تفاوت بلکہ بعض اوقات تضاد صرف معاشی تعلیمات ہی میں نہیں

**عفو اور قصاص**

بلکہ دوسرے قوانین میں بھی ہے مثلاً مظلوم بدل لینے کا قانونی حق رکھنے کے باوجود معاف کر

کتاب ہے اور اخلاق اور روحانیت کا تقاضا عفو و درگزر ہی ہے۔ جبکہ قانون قصاص لینے ہی میں خیر محسوس کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے۔

## قانونی اور فقہی نظام

محنت کے تصور کو اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کی Controlled capitalism ہے کہ اس میں تینوں جمعی تقاضے موجود ہیں۔ اس میں نجی ملکیت (Private ownership)

بھی ہے اور ذاتی دلچسپی بھی، اور ساتھ ہی ساتھ آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے بلکہ قانون حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں دینے کا تقاضا بھی کرتا ہے البتہ جو فرض ہے مثلاً زکوٰۃ وہ جبراً وصول کر لی جائے گی۔ لیکن زکوٰۃ کے علاوہ اس بند کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوع انسانی پر مسلط نہ ہو جائے۔ ایک تو وہ خطوط متین کیسے گئے جن کی موجودگی میں سرمایہ کاری سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم کر کے جبری مساوات کی بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے اور اس درمیانی خلا کو پُر کرنے کے لیے راستہ تجویز کرتا ہے۔ نظام زکوٰۃ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے ایک حد فاصل قائم کر دی ہے کہ جو بھی اس حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مال دار ہیں اور دینے کے مکلف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں معروف معنوں میں پیلے والوں کو Haves اور دوسروں کو Have-nots شمار کر لیجیے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں Have اور جسے چاہیں have-nots بنا دیں۔ بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اتنے اونٹ یا اتنا سونا وغیرہ ہے تو دینے والوں کی صف میں اور اگر اس سے کم ہے تو لینے والوں کی صف میں۔ اس تقسیم کے بعد یہ

لے وَإِنْ تَعَفَّوْا وَتَصَفَّحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التائب)

لے وَلكم في القصاص حيلوة يا أولي الألباب (البقرہ)



دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے  
گراں جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا  
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کر لے گی  
جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سربایہ دارانہ نظام کلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب  
کفالتِ عامہ قابل قبول نہیں رہا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ

تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اپنے تحفظ کے لیے قابل عمل  
اندامات کر رہا ہے جس کی نمایاں مثال برطانوی معاشرہ میں ملتی ہے وہاں ان لوگوں  
کے لیے جو کام نہیں کر پاتے روزگار نہ ہونے کی صورت میں الاؤنس مقرر کر دیے  
گئے ہیں۔ اس طرح بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے لیتی ہے،  
آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی  
کر دیا جاتا ہے لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظام معیشت میں یہ اصول وجودہ سو  
سال پہلے طے کیا جا چکا ہے۔ جہاں سربایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ ٹھوکریں کھا کر  
اب پہنچ رہا ہے۔ اسلام چودہ سو سال پہلے یہ بتا چکا ہے کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے  
اور آگے بڑھنے کی بھی لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرہ کا  
فرض ہے اور زکوٰۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کفالت عامہ کے اصول کو (Collective insurance) بھی کہا جاسکتا ہے  
اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کر کے  
حاصل کرتا ہے لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور  
جمع کرتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچے جس نے بچایا اور جمع  
کیا ہے بلکہ ایک مال دار اور غنی ہے جو بچاتا اور جمع کرتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند  
ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظام زکوٰۃ اور عشر کے  
ذریعے سے ہوتی ہے۔ اب آئیے اس کے فقہی اور قانونی نظام میں کمائی میں حلال و حرام  
کی قیود کی طرف۔

اسلام پہلی شرط حلال و حرام کی پاسداری کی عاید کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تیز اٹھ جانے کے بعد

## حلال و حرام کی حدود

جو طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سدباب کیا جاسکے۔ اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عیش و عشرت کیجیے۔ لیکن یہ وضاحت بہر حال ضروری ہے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو۔ ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو لیکن کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو میں بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچے کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے سرمایہ نہیں مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں شریک ہو، لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو اور منافع کی بھی متعین شرح لینے پر مہصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے جس میں محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حقدار بنا۔ اس مثال سے چھار امور سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا (۲) اپنے تحفظ کی ضمانت (۳) نقصان میں عدم شرکت (۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربوہ ہے۔ اور اسلام نے اپنے نظام معیشت میں اس کی جو کاٹ دی ہے۔ زنا شراب غرض کسی بُرائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا جو ربوہ کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ ربوہ کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود کو کسی کے ذمہ ہے چھوڑ دو۔ ہاں اگر نہیں کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ  
وَرُزُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبْوِ إِن  
كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۚ فَإِن لَّمْ تَقْعَلُوا

فَادْنُوا بِعِزِّ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ - العزہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمائی :

الرَبُّوا سَبْعُونَ جِزْءً اَلَيْسَ بِهَا  
ان يَتَكَبَّرَ الرَّجُلُ اُمَّتَهُ  
ربو کے ستر مجزؤ ہیں اُن سے سب سے  
ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے  
(بیہوشی)

یہ انداز گھلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تشبیہ کیوں اختیار کی لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ بُرائی ہیں لیکن ہم انہیں جلی یا طبعی طور پر بُرائی نہیں سمجھتے جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کے مقابلے میں لائے گا ان سے تشبیہ دے کر بیان کرے گا تو حقیقت واضح ہوگی۔ یہی حکمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاید اسے جرم نہ سمجھو یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سو دے لیا تو کون سی بُرائی ہوگی یہ دراصل ماں سے نکاح کرنے کے مترادف ہے۔ گویا ہمارے نظامِ شریعت میں بدترین بُرائی ربو قرار پاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربو قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے آثار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کرتا ہے اب وہ سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خرید اور بیچ دیا۔ لیا اور دیا صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں آثار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے کبھی یکدم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ کراچی شاک ایکس چینج میں یہ دلچسپ صورت حال دیکھی جاسکتی ہے کہ نظری طور پر سو دے ہو رہے ہیں نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا۔ پاگلوں کی طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور سیٹھوں، ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ یہ منڈی کا آثار چڑھاؤ ہو رہا



ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔ اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے۔ ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لیے ہوئے ہیں ایک تو مجرا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے اس کا سرمایہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کرواتا ہے اور دوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پرییم بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پرییم کی لاگت ڈالتا ہے اور ضرورتاً سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے صرف اس لیے کہ سرمایہ اس کا محفوظ ہو جائے۔ کسی حادثے کی صورت میں جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے کہ ہمارا ایک ملک ایک قوم ہے جس کے مادی مفادات مشترک ہیں۔ تباہی تو آگئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ ملکی سطح پر ضائع ہو گیا۔ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں اس کی حرمت کے لیے اسلام نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے: کٰی لَا یَکُوْنُ دُوْلَةٌ بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ۔

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی حلت و حرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے۔ صحت مند اور معنتی ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن پسندیدہ نہیں۔ جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ

خود کار دوبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ لے۔

مضاربت میں بھی شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے۔ اور منافع میں وہ محنت کش کا سا بھی ہو۔ لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا محض یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو قرضِ حسد دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس کی خوشحالی قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہوگا۔ اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہوگا۔ قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے۔

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء) یعنی تمہاری رضامندی سے۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے۔ آپ مارکیٹ میں گھومیں پھریں آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سو سو روپے ہے۔ آپ خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے۔ اس پر منافع کی شرح اندازاً یہ ہوگی۔ یہ باہمی رضامندی کا سودا ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو چاہے قانوناً یہ بات جائز ہوگی کہ سرمایہ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب! وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔ اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں، کہنے کو تو یہ بات ہے لیکن حقیقتاً مجبوری کو اس میں دخل ہے اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنے غنم پیسنے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا۔ یہ مضاربت کی وہ شکل

ہے جو حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔

**مزارعت** | اس قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے

دوسرا اس پر محنت کرتا ہے اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک کرتا ہے صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزیں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں۔ لیکن قدیم ترین ذریعہ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبالؒ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے :

رزق خود را از زمین بردن رواست

اس متاع بندہ و ملک خداست

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اسے حرام طلق کہتے ہیں وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو جائز نہیں سمجھتے، دوسرے فقہانے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں جن سے کچھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت پر لفظ ربوا استعمال کیا ہے۔

حضرت رافع بن خدیج کے بارے میں حضور کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے کہیں باہر جا رہے تھے۔ دیکھا کہ رافع کھیت کے پاس کھڑے ہیں پوچھا: تم یہاں کیسے؟ انھوں نے عرض کیا: زمین فلاں کی ہے میں نے محنت کی ہے اور میرے اور اس کے مابین یہ شرح معین ہوئی ہے تو حضور نے فرمایا قد اربیتما (تم نے ربوا کا معاملہ کیا ہے) یہ زمین ٹوٹا دو جو کچھ اس پر تھا رافع خرچ ہوا ہے وہ تم لے لو اس لیے کہ اس زمین میں اس کی کون سی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے جیسے تو یہاں ملک کی نوے فی صد آبادی حنیفیوں پر مشتمل ہے لیکن ایسے ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یا تو انھیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا

ہے اور سید الفقہار بھی۔ لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دسے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بہاری دو عملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے اور مراعت اور مضاربت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آئیے چوتھی صورت کی طرف، اسلام میں جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہوگی حرام ہوگی۔ یہ جتنے انڈوانس سودے ہو رہے ہیں یہ تمام معاملات جن میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے لیا، یہ بیع ہے اور اس میں بھی (عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ) باہمی رضامندی ضروری ہے اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیے گئے ہیں، اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے۔ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے اب چاہے کسان کو کچھ پیچھے نہ بچھے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے۔ باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہو گیا ہے۔ یہ سب حرام مطلق ہے، ہمارے دن میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُدھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے جسے بیع سلم کہتے ہیں دو چیزوں کا بالکل تعین ہو جائے اور ان میں سے ایک چیز کا لمبا دے دی جائے یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لوں گا اور یہ بیعانہ لے لیجیے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے۔ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ ہمارے یہاں شریعت کوئی ہیئت حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

OVER TRADING

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اور ٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے تو اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجیے۔ پانچ لاکھ اس وقت آپ کو دے دینا ہوگا۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے

کا موقع نہ ملے۔ اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے کہ اسی لاہور کے ایک بڑے دارالعلوم میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ عالم دین ہیں، شیخ الحدیث ہیں، حدیث کا درس دے رہے تھے، میں بھی بیٹھ گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے جو کئی طریق سے آئی ہے، متن وہی ہے طریقے مختلف ہیں۔

”لایبیع الحاضر للبادی“ یعنی کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے کے مال کو فروخت نہ کرے، درس مکمل ہو گیا۔ موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شراہ کے جو طریقے ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی۔ میں نے سوال کیا: ”حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے اس حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟“

شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیے اور تعجب کیجیے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ”یہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟“ اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انھیں معلوم نہیں تھا۔ بہر حال میں تو نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دور میں شہر لاہور میں ایک شیخ الحدیث جانتے نہ ہوں کہ آڑھت کیا ہوتی ہے، یہ بات بہر حال بظاہر قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ دکائیں بنا کر بیٹھتے ہیں منڈی ہوتی ہے، ان کا اڈہ ہوتا ہے۔ باہر سے لوگ جنھوں نے کاشت کی ہے، اناج اور سبزیاں لے کر آتے ہیں مختلف منڈیاں ہیں، وہ ان کا مال فروخت کرتے ہیں، منڈی والے کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ ”یہ تو مطلقاً حرام ہے۔“ اب اندازہ کیجیے کہ یہ فیصلہ کتنا قطعی ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے کہ دو طرفہ آڑھت کا حکم تو یہی ہے لیکن اگر ایک طرف کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا اس لیے کہ دوسری شکل ہو جاتی ہے گویا کہ وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا۔ جو دکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے، اس طرح وہ اپنی دکالت کی اُبرت لے رہا ہے جس میں اس کے لیے جلت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدیتی کو دخل نہیں لیکن میں عرض کروں گا جو چیز زمانے میں رواج پا جائے ہمارے ہاں فقہار نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموماً بلوئی ہو کوئی چیز عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص نظم

ہے۔ اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو مصالح مرسلہ کہ لیں یا استحسان، ایسی چیزوں کے بارے میں فقہاء نے لوگوں کے لیے آسانی کی گنجائش پیدا کی ہے تو بہر حال اس کے اندر جو جہلت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دو طرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرام مطلق ہے اور ہمارے ہاں اجناس سبزوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دو طرفہ آڑھت کی بنیاد پر ہوتا ہے، مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈال ہوئی ہے جو اصل منگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی در خرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور وہ ایڈوانس کر کے پابندی لگاتا ہے کہ اپنا مال میرے ذریعے فروخت کر دو گے یہ خالص ربوہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی رقم کسی گودبی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنا مال میرے ذریعے فروخت کرے گا۔ یہ درحقیقت ربوہ ہے، یہ گندگی ہے درحقیقت "ظَلَمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" بیع کے بارے میں ان حدود و قیود کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوئی تھی۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر پر مسلط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے۔ اجناس کا تبادلہ تھا۔ ایک شخص نے کھیت میں کام کیا ہے اس نے فصل پیدا کی۔ دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہوا کھدر بنا رہا ہے، دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ہورڈنگ نہیں ہوتی، وہ کتنی گندم اکٹھی کرے گا لیکن جب سونے کو معین کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے۔ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے من گندم کے۔ کرنسی کی لعنت درمیان میں آئی، اب سرمایہ داری کا آغاز ہوا آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجیے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے، اب آپ کو موقع مل گیا آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں، جس طرح چاہیں اونچا نیچا کر لیں، جس طرح چاہیں کنٹرول کریں، یہ اس سرمایہ کی لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ

سارے امکانات پیدا کیے، سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے جبکہ سبکل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں بکڑنے والی فارم کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں اور نہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ تعریف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی ضروریات آپس کے تبادلہ سے پوری کرتے ہیں اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے انسان ٹھوکرین کھا کر دباں پہنچ رہا ہے جہاں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا۔ لایینع الحاضر للبادی" ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ اگر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے۔ لیکن اگر ایک شخص اڈہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈہ کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے۔ یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری سرمایہ داری نہیں بنتی۔ سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات ہیں جو دولت بھی مرکب ہو گئی ہے اسے تقسیم کرنے کے لیے، گردش میں لانے کے لیے وراثت کے احکام ہیں۔ اسلام کا رجحان ارتکاز دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم دولت کی ہے اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے۔ انسانی کمزوریوں کو Exploit کر کے کمانا جنس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرام مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اس بنیاد پر ہے، اس لیے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی شرم گاہ کے لیے لفظ فرج استعمال کیا ہے "اندیشے کی جگہ" فنیل میں جہاں درازیں پر جائیں جس سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے وہ فرج ہے چنانچہ اعضائے جنسی کو بھی قرآن حکیم فرج سے تعبیر کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی فنیل میں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے۔ اس کا کمزور پہلو ہے یہاں سے اس پر بڑی جلدی سے حملہ کیا جا سکتا ہے شراب کی حرمت اور فحاشی کے کاروبار پر قدغن کی یہی حکمت ہے۔ انسان اگر دولت اور دولت کیلئے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے ہی بند کر دیے ہیں۔ اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کریگا۔ آخر وہ سرمایہ کا ہے کے لیے ہے۔ اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ Attachment کم

کر دیا گیا ہے۔ اسلام نے سرمایہ داری پر مختلف پہلوؤں سے اور مختلف اطراف سے حملے کیے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں پرائیویٹ اوزر شپ (Ownership) کی صورت بھی برقرار رکھی ہے۔ ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے گویا کھلا بھی چھوڑ دیا ہے، محنت بھی کرو، کوشش بھی کرو، بھاگ دوڑ کر دکھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ، پسینہ بہاؤ۔ جو کچھ نکلے گا تمہارا ہے اس پر کوئی ظلم اور جبر کے ساتھ قبضہ نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معین ہے وہ دے دو۔ اس حق معین کے ذریعے تو کفالت عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ *Have not* اور *Have* کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نکتہ عدل ہے کہ آزادی بھی بڑا ہے اور مساوات بھی۔ اس کے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کسی موقع پر زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقم سے کفالت عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ یعنی حق ملکیت کو بھی کسی بھی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا جو کسی سرمایہ دار نظام میں ہوتا ہے بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غبار و مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی ایجنسی کی صورت ہو مثلاً جنگ شروع ہو گئی تو خط نے آ لیا اور صرف زکوٰۃ و عشر سے کفالت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ریاست کو نیشنلائزیشن کی اجازت بھی ہے کیونکہ اصل قدر عدل ہے مثلاً اجازت داری ہے کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے اب مالک کے لیے یہ موقع ہے کہ جو وہ قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ دینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضہ عدل پورا نہیں ہوتا، اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری آزادی ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئیں (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں اس لیے کہ یہ مال غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے تو حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت



نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ اس لیے یہ کی سب ریاست کی ملکیت ہوں گی۔ اور اس پر کام کرنے والے موروثی مزارع حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔ البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بدترین جاگیرداری نظام رائج ہو جاتا کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی، قانون کے ڈھانچے میں بھی غریب کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا۔ بجائے سرمایہ کے محنت کو اتنا تحفظ دیا گیا کہ اگر کسی نکتہ عدل بحال نہ رہے تو اسے سبھی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں حضرت عمرؓ کا اجتہاد چمکتا ہوا سورج ہے۔ اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے۔ یہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں ہو پاتے گا۔ جب تک کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کریں کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے جس کے پاس دولت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا لیکن روحانیت کے علمبرداروں کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ گوڈری پوش سلطان الہند نظام الدین اولیاء جو درویش ہیں اور گویا کہ اسلام کی ایمانی تعلیمات کا منظر اتم و کامل ہیں۔ انھیں دنیا کی کسی شے سے رغبت نہیں۔ وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار کر کے فخر کرنے والے نہیں۔ دن بھر کی ضرورت کے لیے دال روٹی اور ایک چھت سرھچپانے کے لیے ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول کی خواہش نہیں۔ مال و زر کے انبار انھیں قطعاً متاثر نہیں کرتے، جب تک کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے ہوں اور وہ آیت "وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَنِيُّ" کا نمونہ بن جائیں، معاشرے کی قانونی اقدامات سے اصلاح نہیں ہو سکتی اس لیے معاشرہ میں ایک ایسا طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے معاشرتی اقدار کا تعین ہوتا ہے جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے آتی رہتی ہے کہ اصل مسئلہ معاش کا نہیں معاد کا ہے، اصل چیز دولت نہیں نیکی ہے، عمل صالح ہے، اللہ کا نام ہے اور اس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے۔ یہ اقدار اگر معاشرے میں روشنی کے مینار کی طرح بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور

کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے لکھیے کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیے، ابوذر غفاریؓ موجود رہنے چاہئیں اور ابوذر تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ وہ فقرا، صحابہ اور اصحابِ صفہ جو معاشرے کے اندر موجود تھے، انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے، جنھوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا۔ حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ایسوں کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ چہرے جبار آؤد، لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا نعالے ان کی قسموں کی لاج رکھے گا۔ یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ، اگر یہ موجود نہ ہو تو محض قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت ہزار ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لیے وصول کرتے ہیں اور یہ سارا ان کے نزدیک حلال ہے اور عیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی، اب لندن، پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے، اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے اور جہاں ڈو کی کیمائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

۲۴ اگست ۱۹۸۲ء

# اسلام کا نظام محاصل

از: ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ تاریخ ۱۱ جنوری ۱۹۶۹ء ہونے والے انٹرنیشنل سیمینار میں جسٹس ذکریا الدین پال صاحب کی صدارت میں منعقدہ انٹرنیشنل کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔

أحمدنا وأصلی علی رسولہ الکریم ، أما بعد  
 قَاعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ  
 محترم صدر مجلس و صدر اراکین انٹرنیشنل کلب لاہور معزز حاضرین !  
 سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس منفرد اور منتخب مجلس کو خطاب کرنے کا موقع دیا۔ میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز منصفو کرتا ہوں اور اس پر آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

البتہ یہ کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے گفتگو کے لیے جو موضوع آپ نے دیا ہے اس میں کسی قدر نا انصافی کا معاملہ ہوا ہے، میرے ساتھ بھی اور موضوع کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ میں نہ معاشیات کے میدان کا آدمی ہوں نہ مالیات کا اور محاصل کا مسئلہ نہایت فنی نوعیت کا حامل اور بے حد پیچیدہ ہونے کے علاوہ بیک وقت معاشیات و مالیات دونوں سے متعلق ہے۔ ایک ایسا ہی لطیفہ حال ہی میں اور بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ جناب سید نذرت بخاری صاحب دچیت ایگزیکٹو چیئر مین انٹرنیشنل فنانس میٹھنے نے حال ہی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا

“ Tax on income vs tax on produce and possession

لیکن بطیفہ یہ کہ یہ مقالہ پیش کیا گیا پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی شعبہ جاتی انجمن یعنی مجلس فلسفہ کے عمیدیاروں کی حلفت برداری کی تقریب میں۔ گویا وہاں موضوع کے اعتبار سے مقرر درست تھا لیکن

سامعین غلط تھے۔ بیان مقررہ توفیقاً بالکل غلط ہے، البتہ سامعین کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا!۔ بہر حال میں نے یہ گمان کیا کہ یہ انتخاب موضوع کے جزو ثانی کے اعتبار سے ہوا ہے یعنی ”

System of taxation in Islam

میں سے مجھ پر نگہ انتخاب اسلام کے ایک ادنیٰ خادِم اور قرآن حکیم کے حقیر طالب علم ہونے کی بنا پر پڑی ہے اور میرے لیے یہ بھی یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ اصل روح دین اور نظام اسلام دونوں کے اعتبار سے اسلام میں نظام محل کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں، آپ کے سامنے رکھ دوں!

” Taxation in Islam “ کے الفاظ سے آپ سے آپ جو حقیقت

ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں کے نزدیک اسلام ایک ایسے نظام معیشت کا ظہور ہے جس میں ذاتی ملکیت (Private ownership) اور آزاد معیشت (Free-enterprise) کو اصول موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اجتماعی یا قومی ملکیت کے اصول پر یعنی نظام معیشت میں تو سب کچھ حکومت ہی کی ملکیت پر ہوتا ہے لہذا حاصل کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں آغاز گفتگو ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ مفروضہ جڑو آ تو درست ہے لکھتے صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تصور یہ کہ صرف ایک رخ ہے اور اس سے پوری حقیقت سامنے نہیں آتی!

میرے نزدیک نظام معاشی کے اعتبار سے اسلام کے دو رخ یا دو پہلو ہیں، اور یہ دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک Interdependent ہیں۔ اور اسلام کی برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال و اجتماع ہی سے ہوسکتا ہے اور یہ کتنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو ننگا ہوں سے اوچھل رہ جاتے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصور سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہوگی۔ ان دو پہلوؤں سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و روحانی نظام ہے۔ اور دوسرا قانونی و فنی نظام، ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں منضاد ہوتے ہیں؛ تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ”دعویٰ“ (Thesis) اور ”جوابِ دعویٰ“

سے تعبیر فرمایاں اور ان دونوں کے امتزاج کو

قرار دے لیں، بہر حال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے! **Synthesis** ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک نچھڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور تھیں ہیں اس لیے کہ اس صورت میں تو تھرور ویش برجان درویش کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بدلہ لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اسلام کا قانونی و فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: **وَكَمْ فِي الْقِصَاصِ حِكْمَةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ** یعنی اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے! لیکن دوسری طرف اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے، چنانچہ کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ **وَإِنْ تَعَفَوْا أَقْرَبَ لِلنَّقْوَىٰ** یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے! کہیں تشویش و ترغیب کے انداز میں فرمایا جاتا ہے **وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ** یعنی وہ لوگ جو عرصۂ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں! دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے مقام و محل پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسن معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اسی پر قباس کر کے سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں؛ چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled capitalism) ہے۔ اس لیے کہ اس میں افرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے سرمایہ داری بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری جانب اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں پورے انشراح صدر سے عرض کرنا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت، (Spiritual socialism) ہے، اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت

کائنات موجود ہے اگرچہ انفرادی نہیں اجتماعی۔ لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رو سے انسانی ملکیت کی کئی نئی کرتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَنَحْنُ بِذٰلِكَ مُخَبَّرٰتٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ جو کچھ ہے ان سب کا مالک صرف اللہ ہے! انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا۔ خواہ وہ زمین ہو، مکان ہو، ساز و سامان ہو، روپیہ پیسہ ہو، وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں، اس کے ہاتھ پاؤں، اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں بقول شیخ سعدیؒ :-

”اے امانت چند روزہ نزد ماست : در حقیقت مالک ہر شئی خداست  
بیا بقول علامہ اقبالؒ :-

”رزقِ خود را از زمین بُردن رواست : ایں متاعِ بندہٗ وُ ملکِ خداست“  
اسلام کے اس روحانی سوشلزم کی رو سے جس کا آغاز انسانی ملکیت کے تصور کی کئی

نئی سے ہوتا ہے، اس دنیا میں انسان کا حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور بس !!! -  
ضرورت سے زائد اس کے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کو قانونی و فنی حق حاصل ہو تو ہو  
حقیقی حق کوئی حاصل نہیں۔ یہ دراصل دوسروں کا حق ہے جسے اللہ نے صرف بطور امتحان  
اس کے تصرف میں دیدیا ہے تاکہ دیکھے کہ آیا وہ اسے حقداروں تک پہنچا کر اور حق بقدر  
”رسید“ والا معاملہ کرے مرنج رو ہوتا ہے یا دوسروں کے حق پر قبضہ مخالفانہ جہا کہ بیٹھتا  
ہے اور اس قدر زیادہ کے بل پر اپنا شے نوع پر دھونس جاتا ہے اور شادیوں اور دوسری  
تقریبوں میں اس غضب شدہ دولت کو اللوں تللوں میں اڑا کر محروموں کے زخمی دلوں  
پر اور نمک چھڑکتا ہے !!!۔ اب جن کے دلوں میں ایمان واقفکارانہ ہو جاتا ہے اور اللہ  
اور آخرت پر ان کا یقین محکم قائم ہو جاتا ہے اور ان کی نگاہ ہر دم ”اَنَا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ  
رٰجِعُونَ“ پر جمی رہتی ہے ان کی روشن لامل حالہ پہلی ہوتی ہے جس کو قرآن نے واضح  
کیا ان الفاظ میں کہ ”يَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَضُوْبُ“ یعنی ”راے  
نبی، وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں اللہ کی راہ میں کس حد تک دے ڈالیں  
کہہ دیجئے جو بھی زائد از ضرورت ہو!“۔ اور جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے

اس شعر

پھر یہ

قرآنی

میں

درا

اس

بلے

اور

کرنے

اللہ

دیا

یقیناً

اور

تصور

یقیناً

قانون

حق

رکھتے

ہے

کما

کے

اس

اس شعر میں کہ "قل العفو" میں پوشیدہ تھی اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !

پھر یہ بھی کہ اسے اپنا کوئی احسان نہ سمجھو، بلکہ یہ تو تھا ہی دوسرے حق بھوائے الفاظ  
قرآنی "وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مِّمَّا كَسَبَ الْوَالِدُ وَالْوَالِدَاتُ وَالْأَوْلَادُ الْمَسْكِينُ"۔ ان کے مالوں  
میں معین حق ہے سالموں اور محروموں کا، اور ذاتِ ذالستزلی حَقَّهُ وَالْمَسْكِينُ  
ذَاتِ السَّبِيلِ"۔ اور ادا کرو قرابت داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق !

۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کائنات اور خود اپنی ذات و حیات کی اصل حقیقتوں سے بالکل  
بے خبر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی روش ہوتی ہے دوسری۔ جس کا اولین نتیجہ ہے اسراف  
اور انتہائی منزل ہے تہذیب !۔ اسراف کہتے ہیں جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زائد خرچ

کرنے کو اور یہ بھی بہت معیوب ہے۔ جبکہ تہذیب ہے بالکل بلا ضرورت صرف نمود و نمائش اور  
اللؤلؤ اور تملقوں میں روپیہ اڑانا اور یہ وہ جرم ہے جس کے مرتکبوں کو شیطان کے بھائی قرار  
دیا گیا۔ بھوائے الفاظ قرآنی "إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ"۔  
یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اعَاذَ اللَّهُ مِنْ ذَالِكِ۔

الغرض اسلام کی روحانی و اخلاقی۔ یا ایمانی تعلیمات کا حاصل اعلیٰ ترین اور عظیم ترین

اور پورا اعتبار سے کامل ترین Spiritual socialism ہے، لیکن یہ

تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرے رخ کے اعتبار سے اسلام کا نظام معیشت

یقیناً ایک Controlled capitalism ہے۔ اس لیے کہ اسلام

قانونی و فقہی اعتبار سے افراد کو زمین، مکان، ساز و سامان حتیٰ کہ ذرائع پیداوار تک پر ایسا

حقِ تصرف عطا کرتا ہے جو کم از کم ظاہری اعتبار سے حقِ ملکیت سے کامل مشابہت

رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حقِ تصرف یا حقِ ملکیت وراثتہً اولاد و احفاد کو منتقل بھی ہو سکتا

ہے۔ الغرض، اپنے قانونی و فقہی نظام میں اسلام نے انسان کے جبلی تقاضوں کو تمام و

کمال محفوظ رکھا ہے اور نجی ملکیت (Private ownership) ذاتی حوصلہ بندی

(Free-enterprise) اور آزاد معیشت (Personal incentive)

کے اصول سمجھنا کہ کو قانونی سطح پر برقرار رکھ کر "سرمایہ کاری" کے لیے وسیع میدان پیدا کر دیا ہے البتہ

اس ضمن میں بعض نہایت اہم اور بنیادی اور حد درجہ مؤثر احتیاطی تدابیر ایسی اختیار کی ہیں

جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں صحتمند سرمایہ کاری کی فضا تو قائم رہے، لیکن یہ سرمایہ داری کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ان احتیاطی تاخیدی تدابیر کے بارے میں تفصیلی بحث میری موجودہ گفتگو کے ممنوع سے خارج ہے، صرف اشارۃً عرض کر سکتا ہوں کہ سود یعنی (Interest) — سٹہ یعنی (Speculation) اور احتکار یعنی (Hoarding) غیردکی حرمت کی اصل غرض و غایت یہی ہے جو میں نے بیان کی یعنی سرمایہ کاری، سرمایہ داری نہ بن جائے، اور capitalism بہرہ حال Controlled رہے، — البتہ اس حقیقت سے انکار صرف بہت دھری ہی سے کیا جاسکتا ہے کہ سرمایہ کاری خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو فرق و تفاوت کو لازماً جنم دے گی اور اس سے اغنیاء (Haves) اور فقراء (Have-nots) کا وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی دوڑ میں دس افراد شریک ہوں اور خواہش یہ ہو کہ وہ سب برابر رہیں نہ کوئی آگے بڑھے نہ پیچھے رہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ممکن ہے، یعنی یہ کہ ان سب کو ایک رستے سے باندھ دیا جائے۔ بصورت دیگر تو لازماً کوئی آگے بڑھے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا۔ اگر یا اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں جبری مساوات (Forced equality) کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن اتنی ہی بڑی اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام کے نظام محاصل میں اسی فرق و تفاوت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے مقصد کو اولین اور مقدم ترین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اغنیاء اور فقراء کی تقسیم کو اعتباری یا عارضی یعنی (Arbitrary) نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ و باضابطہ حد فاصل کھینچ دی ہے جسے اصطلاح شرع میں نصاب کہتے ہیں جس کا تعین اموال کی تقریباً تمام بڑی بڑی صورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد سونے کا مالک اغنیاء میں شمار ہوگا، اور ساڑھے سات تولے سے کم رکھنے والا فقراء میں سے اور اسلام کے نظام محاصل کا اہم رکن یعنی مرکز کو اتنا اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ”تَوَخَّذُوا مِنَ اَغْنِيَاءِ هِمَّةً وَرَوَّضُوا إِلَى اَفْتِكِ اِهْمَةً“ اور اس طرح وہ تمام تقاضے تمام و کمال اور باحسن و جوہ پورے ہو جاتے ہیں جنہیں اس دور میں ’اجتماعی ضمانت‘ (Collective insurance) یا سماجی تحفظ (Social security) کہتے ہیں۔



سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور اس سب پر مستزاد ہے وہ روحانی و اخلاقی اور ایمانی و احسانی تعلیم جو اسلام اپنے برہانے والے اور قرآن اپنے ہر پڑھنے والے کو مسلسل دیتا ہے کہ لذات دنیوی اور نفس و تنعم سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اپنی ضروریات کو کم سے کم کرو، اور حقیقی اور واقعی ضروریات سے جو بھی زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں دے دو اور یہ نہ سمجھو کہ مال میں واحد حق زکوٰۃ ہی ہے۔ یہ تو کم انکم اور ناگزیر قانونی ضابطہ ہے۔ ایمان کا اصل تقاضا و مطالبہ اس سے بہت آگے ہے۔ بموجب فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "فِي الْمَالِ حَقٌّ مِّسْوِيٌّ" "الزكاة" مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں۔ اور اچھی طرح جان لیجئے کہ نظام اسلامی کا اصل حُسن و جمال اور اس کی اصل برکات اُس کی اسی دوسری اور تکمیلی تعلیم و تلقین میں مُضمّن ہیں !! —

اسلامی نظم مملکت میں نظامِ محاصل کے بارے میں ایک اہم اور اصولی بات اور بھی ہے جو مد نظر رہنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے اور اگرچہ اس کی حدود میں بسنے والے تمام شہری بلا امتیاز مذہب و ملت بعض اعتبار سے بالکل مساوی بھی ہیں جیسے حرمتِ جان و مال میں تاہم بہت سے اعتبارات سے شہریوں کا دو حصوں میں منقسم ہونا لازم و لابد ہے۔ یعنی ایک وہ جو اس نظریے کو ماننے والے ہوں جس پر ریاست قائم ہے اور دوسرے وہ جو اسے نہ مانتے ہوں، چنانچہ اسلام کے نظامِ محاصل کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور بنیادی تقسیم اسی اعتبار سے ہے کہ بعض کی ادائیگی صرف مسلمانوں پر ہے یعنی اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کے ماننے والوں پر اور بعض کی غیر مسلموں پر یعنی ان پر جو ان اصولوں کو نہیں مانتے، پھر یہ کہ ان دونوں کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان کے مدتِ صرف میں بھی اساسی اور بنیادی فرق ہے۔ چنانچہ مسلمانوں سے نقدی کی تمام صورتوں اور اموالِ تجارت پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جس کی شرح کل مالیت کا ۲ فی صد ہے، ان کی زرعی اراضی میں سے نہری یا چاہی زمینوں کی کل پیداوار کا بیسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی ۵ فی صد۔ اور باہرانی زمینوں کی پیداوار سے کل کا دسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی ۲ فی صد۔ اور ان دونوں کی نوعیت TAX کی نہیں ہے بلکہ اصلاً عبادت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح

بھی بالکل معین ہے جس میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہیں ہے، ورنہ ان کی حیثیت عبادت کی نہیں رہے گی بلکہ صرف ایک Tax کی رہ جائے گی۔ اسی طرح ان کی مدت صرف بھی معین ہیں، ان کے علاوہ کسی تبدیلی میں صرف نہیں کیا جاسکتا۔ جن کا مجموعی حاصل وہ اجتماعی ضمانت یا سماجی تحفظ ہے جس کا ذکر اُدپر ہو چکا ہے!

اس کے برعکس غیر مسلموں کے اموال سے حزیہ وصول کیا جاتا ہے اور ان کی زمینوں سے 'خراج' اور ان دونوں کی حیثیت خالصتہ Tax کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی شرح بھی معین نہیں، ان کا تعلق حکومت وقت کی صوابدید پر ہے اور اسی طرح ان سے حاصل شدہ رقم صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں، جملہ شعبہ ہائے حکومت کے اخراجات اور نظم و انصرام مملکت کے تمام تقاضے ان سے پوسے کئے جاسکتے ہیں۔ ملہ اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک اور شعبہ جس کی شرح معین ہے، وہ اموالِ خُس میں یعنی پانچواں حصہ یا بیس فی صد جو اموالِ غنیمت، کنز یعنی دینے، اور دیکان یعنی معدنیات سے وصول کیا جاتا ہے۔ ان کی جس طرح شرح وصولی زکوٰۃ و عشر کی طرح

لے ایک نہایت اہم اور ترقی اور فقر حنفی کی رو سے نہایت محکم رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان کی جملہ اراضی 'خراج' کے حکم میں ہیں نہ کہ 'مشری' کے حکم میں، گویا اگر امام ابوحنیفہؒ کی مزارعت کے مطلقاً حرام ہونے کی رائے کو کسی وجہ سے چھوڑ کر صاحبین یعنی قاضی البریلویؒ رح اور امام محمد شیبانیؒ رح کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی پاکستان کی جملہ اراضی کے کاشت کار براہ راست ریاست پاکستان کے 'مزارع' ہوں گے

اور ان کا "خراج" براہ راست خزانہ عامہ میں جمع ہوگا۔ جس سے TAXATION کے پورے نظام میں انقلاب آجائے گا۔ اور غالباً انکم ٹیکس کی نو برے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس موضوع پر پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کی ایک مختصر تحریر اس کتا بچہ کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بعض نظریات کی بنا پر ہمارے دینی حلقوں میں شدید متنزاع، شخصیت بن چکے ہیں لیکن ہمیں تو ہدایت ہے کہ "انظر و الی ما قال ولا تنظروا الی من قال"۔ یعنی یہ دیکھو کہ کہا کیا جا رہا ہے، اسے نظر انداز کر دو کہ کہنے والا کون ہے! لہذا اس معاملے میں ان کی رائے پر جملہ اہل علم کو غور کرنا چاہیے۔

(اسرار احمد)

معیّن ہے اس طرح بذاتِ صرف بھی صرف وہی ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی۔ اس فہرست میں صرف ایک اور شق کا اگر اضافہ کر لیا جائے تو ایک پہلو سے بات مکمل ہو جائے گی اور وہ یہ کہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ جو صدقاتِ نافلہ مسلمان اپنی مرضی سے فی سبیل اللہ دیں ان کے بارے میں انہیں اختیار ہے کہ چاہے از خود فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیں چاہے اسلامی حکومت کے حوالے کر دیں (بخلاف زکوٰۃ اور عشر کے کہ وہ لازماً حکومت ہی کو ادا کرنے ہوں گے!) اگر وہ ایسی قوم بھی حکومت کے حوالے کر دیں تو وہ بھی صرف ان ہی بذات میں صرف ہوں گی جن میں زکوٰۃ اور عشر کی رقوم کا صرف جائز ہے۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے اسلامی حکومت کے عام محاصل کا جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

یعنی وہ اموال جو غیر مسلموں سے جنگ کے سوا کسی اور طریق سے

حاصل ہوں۔ اپنی اصل کے اعتبار سے جزیہ اور خراج بھی نہ ہی

۱۔ فے

کی قسمیں ہیں، لیکن عرف عام میں یہ لفظ ان اموال پر بولا جاتا ہے جو حاصل تو متحارب غیر مسلموں (یعنی Hostile non-Muslims) سے ہوئے۔

لیکن ان میں فی الواقع جنگ اور خونریزی کی نوبت نہ آئی ہو۔

یعنی حکومت کی مملوکہ اراضی سے حاصل شدہ

۲۔ کراء الارض

لنگان۔

یا درآمدی و برآمدی محصولات حسن کے بارے میں ایک ذیل ہے

عشور

شرح کا تعین کچھ اس طرح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے اموال میں سے

۲۴ فیصد اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں یعنی ذمیوں کے اموال میں سے پانچ فیصد اور

دوسرے غیر مسلموں سے دس فی صد لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ شرحیں کسی نقص پر مبنی نہیں ہیں اور

ان میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے جس میں ظاہر ہے درآمد و برآمد کے کاروبار کا توازن

اور عالمی منڈی کے اتار چڑھاؤ کو اصل دخل حاصل ہوگا!

یعنی وہ مزید Tax جو حکومت حسب ضرورت شہریوں

پر عاید کر سکتی ہے۔ عام حالات میں بھی اگر دفاع اور نظم

۴۔ ضرائب

مملکت کی ضروریات اور فقرا کی احتیاجات مندرجہ بالا تمام تدوین سے پوری نہ ہو

رہی ہوں اور خاص اور تنگامی حالات میں بھی جیسے زمانہ جنگ یا قحط سالی یا کسی عمومی

DEPRESSION کے باعث عام بے روزگاری وغیرہ - ایسی خاص صورتوں میں اسلامی حکومت کو اغنیاء پر Tax لگانے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے -

یعنی متفرق آمدنی جیسے کوئی شہری اگر لاوارث فوت ہو  
**۵۔ اموالِ فاضلہ** | تو اس کی کل جائیداد اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی ہے، اسی طرح کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کا کل مال بھی بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر کوئی غیر مسلم شہری بغاوت کا مرتکب ہو جائے تو اس کی کل میراث بھی اسلامی حکومت کا حق ہے -

وقف اگر کسی خاص مقصد اور متعین مقصد کے لیے ہوں تو ان  
**۶۔ اوقاف** | کی آمدنی انہی مصارف پر خرچ ہوگی، لیکن اگر کوئی شہری عام فی سبیل اللہ وقف کرتا ہے تو گو یا وہ اسلامی حکومت کی ملکیت شمار ہوگا اور اس کی کل آمدنی بیت المال میں شامل کی جائے گی - ان میں سے فے، اموالِ فاضلہ اور عام اوقاف تو کل کے کل بیت المال میں داخل ہوں گے، البتہ ان کے ضمن میں کسی شرح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں تھا - البتہ کراء الارض، ضرائب اور عشرور کی خثیت Taxes کی ہے اور ان کی شرح وقتاً فوقتاً تبدیل کی جاسکتی ہے جیسے بھی ضرورت داعی ہو - اسی طرح ان کے حاصل شدہ آمدنی کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں - یہ انتظام مملکت کے اخراجات اور رفاہ عامہ، عمومی فلاح و بہبود اور Public works سب پر خرچ کی جاسکتی ہے - اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ ضرائب اور عشرور میں سے بھی جو رقوم مسلمانوں سے حاصل ہوں گی ان کی مدد صرف بھی صرف وہی ہوں گی جو زکوٰۃ، عشر اور صدقات کی ہیں - اس تفصیل سے ایک جانب تو وہ حقیقت بالکل مبرہن ہوگئی جو پہلے عرض کی جاچکی ہے یعنی یہ کہ اسلامی نظم مملکت میں Taxation کے اعتبار مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑا بنیادی فرق ہے اور یہ فرق فطری بھی ہے اور عقلی و منطقی بھی - اس لیے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسلامی حکومت بس ایک امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور بس جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک اسلامی حکومت زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندہ ہوتی ہے

اور اس کا مقصد صرف دنیوی فلاح و بہبود ہی نہیں ہونا اخروی فوز و فلاح بھی ہونا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قائم ہی ہوتی ہے۔ نظریہ اسلامی کی ترویج و اشاعت اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور غلبہ و اقامت کے لیے۔ اس لیے اس کی خیر خواہی و وفاداری اور اس کا بقاء و استحکام مسلمان کے عین دین و مذہب کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنی کمائی یا اللہ کے فضل میں سے جو کچھ دیتا ہے اسے عبادت سمجھ کر دیتا ہے۔ اُس کے اس تصور کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے کہ ان کی فرضیت اور شرح ادائیگی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہیں، حکومت وقت صرف جمع کرنے والی یعنی (Collector) اور تقسیم کرنے والی یعنی (Distributor) ہے نہ کہ عاید کرنے والی اور عدم ادائیگی یا ادائیگی میں کتمان و فریب صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے جس کا وبال ابدی اخروی زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

دوسری حقیقت یہ بھی واضح ہو گئی کہ مسلمان شہریوں سے اسلامی حکومت کو جو کچھ وصول ہو اس میں سے اکثر کا اولین حصہ صرف اس خلیج کو پاتا ہے جو اسلام کے قانونی و فقہی نظام میں موجود آزاد معیشت کا لازمی نتیجہ ہے خواہ وہ کم ہو یا بیش!

تیسری اہم حقیقت جو دنیا کے دوسرے اکثر نظام ہائے Taxation سے مختلف ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کا غالب رجحان یہ ہے کہ Tax کے لیے اساس و بنیاد نہ فرد بحیثیت فرد ہو جس پر Poll یا Capitation tax عاید کیا جاتا ہے، نہ آمدنی ہو جس پر Income tax کی بنیاد ہے، نہ

وسعت خرچ یا Capacity to spend ہو بلکہ کل پیداوار یا ملکیت یعنی

(Total produce or possession) ہو۔ جیسا کہ زکوٰۃ یا محشر یا

شمس سے ظاہر ہوتا ہے۔ TAX عاید کرنے کی ان دوسری اساسات کے مقابلے میں

اسلام کی اختیار کردہ یہ اساس کن مصلحتوں پر مبنی ہے۔ یہ ایک دقیق فنی مشلہ ہے، تاہم اس ضمن میں ایک کوشش قریبہ زہمت بخاری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کی ہے جس کا

ذکر میں آغاز میں بطور لطیفہ کرچکا ہوں۔ ان کی تخنیک کا لب لباب یہ ہے کہ Income

پر tax عاید کرنے سے افراطِ زریا Inflation کا رجحان بڑھتا ہے جبکہ

پر ٹیکس عاید کرنے سے اس کا قلع  
 'Total produce or possession' پر ٹیکس عاید کرنے سے اس کا قلع  
 قلع ہوتا ہے۔ میں ایک غیر فنی انسان کی حیثیت سے ان کی دلیل کو ٹوڑنے کے طور پر سمجھ نہیں  
 پایا، تاہم یہ ایک اہم خیال ہے جو ایک واقف حال شخص نے ظاہر کیا ہے اس پر توجہ  
 دی جانی چاہیے۔

میرے سامنے ایک عامی کی حیثیت سے اس کی ایک دوسری اور عظیم تر مصلحت  
 آئی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا لازماً جوئے شیر کا کام صدق ہے۔  
 اور اس کے لیے بہت لمبے چوڑے اور Elaborate accounting کی ضرورت  
 ہے۔ جبکہ اسلام کے نظام محاصل میں سے اکثر کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ ان ظاہر  
 ہے کہ بڑے بڑے شراکتی اداروں یا Limited companies کے لیے  
 تو تفصیلی حساب کتاب ویسے بھی ناگزیر ہے تاکہ حصہ داروں کے مابین منافع کی تقسیم صحیحاً

ہو سکے اور اگر یہ ادارے اپنے Size کے اعتبار سے اس Accounting  
 پر زور کثیر صرف کریں تو کوئی زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔ لیکن آبادی کی عظیم اکثریت چھوٹے  
 چھوٹے کاروبار لے بیٹھی ہے اس کے لیے حساب کتاب کا یہ معاملہ خالص در دوسری ہے  
 اور محض ضیاع بھی۔ یہ معاملہ چھوٹے چھوٹے دوکانداروں ہی کا نہیں ہے۔ ہمارے درمیانی  
 طبقے کی عظیم اکثریت کا ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کا تصور کریں جو روزانہ اوسطاً سو ڈیڑھ  
 سو مریض دیکھتا ہے، اب اگر وہ اپنی آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا چاہے اور وہ بھی  
 — ایسا جو انکم ٹیکس آفیسر کے نزدیک قابل تصدیق ہو تو اسے ہر مریض کا نام اور  
 اس کو روزانہ دی جانے والی ادویات کی تفصیل کے علاوہ ادویات کی خرید و فروخت  
 کا پورا حساب اور ان کا مکمل سٹاک اکاؤنٹ رکھنا ضروری ہوگا جس کے لئے ایک  
 کلرک اور ایک اکاؤنٹنٹ کی خدمات لازمی ہیں۔ اور ان سب پر جو خرچ  
 آئے گا وہ خالص Non-productive ہوگا۔ وقس علی ذالک۔  
 اس کے برعکس اسلام کے نظام محاصل میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص  
 سال کے آخر میں اپنی مالی حالت کا حساب باسانی کر سکتا ہے اور اس پر زکوٰۃ ادا  
 کر سکتا ہے۔ وَاخِرُ دَعْوَانَا انِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۵

# عشری اور خراجی اراضی

پاکستان میں عشری نہیں صرف خراجی زمین ہے

— پر فیس رفیع اللہ شہاب —

نظام زکوٰۃ کے بارے میں عبدالوہاب شقرانی نے اپنی مشہور کتاب المیزان اکبری جلد ۱۰۰ م کے صفحہ ۲ پر اس بارے میں امت مسلمہ کے تمام علماء کا اجماع نقل کیا ہے (اجمع العلماء ان لیس مع الزکوٰۃ شیئا)

اسلامی ریاست میں حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مدد خراجی زمین ہے۔ اور آج بھی اسے

آمدنی ہی سے پورے ہوتے ہیں اور اس نظام کی سب سے بڑی خراجی زمین ہے آج بھی اس مد سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ کسی مزید ٹیکس کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسلامی قانون کے مطابق تمام مفتوحہ ممالک جن میں برصغیر پاکستان و بھارت شامل ہیں کی ارضی خراجی کے ذیل میں آتی ہیں۔ تمام اسلامی ادوار میں اس اسلامی قانون پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں انگریزوں نے بنگال کے بندوبست و دائمی کے ذریعے یہاں کی اراضی کی حیثیت بدل دی اور غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ ان زمینداروں نے اپنی طرف سے عشر ادا کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ علماء اس کے جواز کا فتوے دیں لیکن چونکہ ایک دفعہ خراجی قرار دی ہوئی زمین اب تک عشری میں تبدیل نہیں کی جاسکتی اس لئے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا۔ میں اس بارے میں جو سینکڑوں فتوے پوچھے گئے ان سب کا یہی جواب دیا گیا کہ یہ اراضی کسی صورت میں عشری میں تبدیل نہیں ہو سکتی ہاں، احتیاطاً کوئی عشر ادا کرے تو اس کی اپنی مہنتی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک مفصل مضمون نولے وقت میں شائع ہو چکا ہے مجھے توقع تھی کہ علماء کرام اس سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائیں گے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کے نفاذ کے نعرے تو بیس سال سے لگ رہے ہیں لیکن اس مقصد کے لئے جس قدر ہوم ورک، کی ضرورت ہے اس سے پہلو تھی کی باقی رہی اس موضوع پر راقم نے پندرہ سال پہلے تحقیقی کام شروع کیا اور ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک مختصر سی میٹنگ میں اسلامی نظر بانی کونسل کے اس وقت کے چیئرمین علامہ علاؤ الدین صدیقی نے نظام عشر پر گفتگو شروع کی تو راقم نے بہت

سے اہل علم کی موجودگی میں اس کی تصحیح کی کہ ہمارے ملک کی اراضی تخرابی کے ذیل میں آتی ہیں جن پر عشر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں سے تمام حواہج ان کے سامنے رکھ دیئے۔ علامہ شاہ محمد جعفر پھولاری اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے سکالروں نے میرے نقطہ نظر کی تائید کی چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ میں نظریاتی کونسل کی رہنمائی کے لئے ایک مسلسل کتاب اس موضوع پر تیار کروں جس کی نگرانی مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ کریں گے جو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سینئر رکن تھے اور آج بھی اس منصب پر فائز ہیں۔ راقم نے خالد صاحب کی لائبریری میں بیٹھ کر دو ماہ میں مطلوبہ کتاب تیار کر کے ان کے حوالے کی اور ساتھ ہی اس کے مطابق ۱۹۷۹ء کا قومی بجٹ بھی بنا دیا جس میں موجودہ ٹیکسوں میں سے ایک ٹیکس بھی نہ تھا۔ میرا تحقیقی کام ان حضرات کے لئے چنبھنے کی بات تھی اس لئے انہوں نے مختلف ذرائع سے اسے چیک کرایا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور پھر ادارہ نے اسے کتاب کی صورت میں اسلامی ریاست کا مابیناتی نظام کے عنوان سے شائع کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب جب زکوٰۃ اور عشر ارضی منس نافذ کیا گیا ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے یہ تفصیلات نہیں بھینس۔ اتفاق سے انہی دنوں مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ جن کی نگرانی میں راقم نے یہ تحقیقی کام کیا تھا، ادارہ تحقیقات اسلامی میں تشریف لائے۔ جہاں اسکالراسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ راقم نے خالد صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے عشر کا نیا قانون بناتے وقت پچھلے تمام تحقیقی کام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کے گوش گزار کی کہ امت مسلمہ کے ستر فقہی مذاہب کہ جن میں سے اکثر اب ختم ہو چکے ہیں کے تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے۔ اور اسلامی فقہ کی ڈیڑھ ہزار کتابوں میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کے تحت پاکستان کی اراضی کو عشری کے ذیل میں لایا جاسکے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے تو کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا کہ یہ ادارہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے تحقیقی مواد فراہم کرنے کی خاطر قائم کیا گیا لیکن اگر ان کی تحقیق کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس ادارے پر غریب عوام کے کروڑوں روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے خالد صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ صدر صاحب نیک نیتی سے اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں اس لئے خدا کے لئے ان کے سامنے صحیح تفصیلات پیش کی جائیں خالد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی توجہ



اس طرف دلائل میں گئے۔ علمائے کرام کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لئے فقہ کی ابتدائی کتاب ”مآلہ بداء“ کا حوالہ یہاں غیر مناسب ہو گا۔ یہ کتاب کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور مصنف نے علماء حضرات کو نظربان، بھٹوں میں گم ہونے سے بچانے کے لئے اس میں سے وہ تمام بحثیں خارج کر دی ہیں۔ جن کا برصغیر پاکستان و بھارت سے کوئی تعلق نہیں۔ عشر کا مسئلہ انہوں نے ایک چوتھائی سطر میں حل کر دیا ہے کہ چونکہ برصغیر میں کوئی عشری زمین نہیں اس لئے عشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور آخر میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب فتاویٰ عالمگیری کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو جس کے مطابق اگر کسی مسلمان علاقے پر دشمن کچھ عرصے کے لئے غالب آجائے اور مسلمان اسے پھر دوبارہ حاصل کر لیں تو اس کی اراستی اپنی اصل یعنی خراجی حیثیت کی طرف لوٹ آتی گی (جلد سوم اردو ایڈیشن ص ۷۷ مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور) امید ہے علماء حضرات فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ فرما کر اس کی صحیح اسلامی حیثیت عوام کے سامنے لائیں گے

خدا آں ملتے را سہ دری داد !  
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت  
بر آں قوسے سروکارے نہ وارد  
کہ دہقانیش برائے دیگران کشت

❖

جس کھیت سے دہقان کو بیسترنہ ہو فرزی  
اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا د

●

خواجه ازنون رگ مزدور سازد لعل ناب  
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقان خراب  
انقلاب !

انقلاب — اے — انقلاب !

(اقبال)

## تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

4.00	.....	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	1
5.00	.....	راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	2
10.00	.....	قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	3
12.00	.....	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	4
2.00	.....	قرآن اور امین علم	5
6.00	.....	رسول کامل ﷺ	6
4.00	.....	نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت	7
3.00	.....	نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	8
3.00	.....	معراج انبئی ﷺ	9
4.00	.....	شینہِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین)	10
3.00	.....	سانحہ کربلا (شہادتِ حسین کا اصل پس منظر)	11
2.00	.....	اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اسلحہ	12
10.00	.....	اسلام میں عورت کا مقام	13
2.00	.....	عظمتِ صوم	14
3.00	.....	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	15
5.00	.....	اسلام اور پاکستان	16
3.00	.....	علامہ اقبال اور ہم	17
		<h3>ترجمہ</h3>	
5.00		ماذا یجب علی المسلمین تجاه القرآن (قرآن مجید کے حقوق کا عربی ترجمہ)	1
5.00		حقوق متدرجہ بر مسلمان (فارسی ترجمہ)	2
5.00		The Obligations Muslims owe to the Quran. (انگریزی ترجمہ)	3
5.00		راہِ نجات	4
4.00		قرآن اور امین علم	5
4.00		اسلام کی نشاۃ ثانیہ	6
5.00		رُسرُفِ حکیم کا ایک باب	7
		The way to Salvation—In the light of Surah Al-Asr.	
		The Quran & World Peace.	
		Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.	
		Rise & Decline of Muslim Ummah.	

# پرائم



پرائم

Prime



Prime



Prime



پرائم ڈیری لمیٹڈ لاہور



# احبابِ نوٹ فرمائیں!

حکومت سرحد کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کے باعث  
پشاور میں تنظیم اسلامی کا روزہ علاقائی اجتماع منسوخ کر دیا گیا  
واضح رہے کہ میثاق کے تازہ شمارے میں متذکرہ بالا اجتماع کیلئے  
۲۴ تا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کی تاریخوں کا اعلان کر دیا گیا تھا

اب اس اجتماع کی بجائے

## امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد

۲۳ تا ۲۵ ستمبر، کراچی کا دورہ کریں گے (ان شاء اللہ)  
سوموار ۲۳ ستمبر کی شام حسب معمول تاج محل ہوٹل کراچی کے آڈیٹوریوم میں

## شام الہیہ

کی ماہانہ نشست منعقد ہوگی۔ جس میں درس قرآن کا موضوع حسب ذیل ہوگا:

راہِ حق کی ابتلا و آزمائش میں قرآنی ہدایات

سورۃ عنکبوت کی روشنی میں

شرکت کی دعوت عام ہے۔ خواتین کے لئے پارہہ انتظام ہوتا ہے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال، لاہور۔ قیمت فی شمارہ ۳ روپے